الہ دین کا چراغ
یہ کاغذ کا ایک ٹکڑا ہی تو ہے۔ بوسیدہ، بھولا بسرا، جو کسی الماری کے
گھُپ اندھیرے میں گردوپیش سے بیگانہ، مہینوں، برسوں بے حس و حرکت پڑا رہتا ہے۔
مگر —— ایک حرماں نصیب بیوہ کی آنکھ سے ٹپکنے والے آنسو اس
بے جان پُرزہ کاغذ کو ایک معجزہ بنا دیتے ہیں۔ الہ دین کا چراغ
—— اس چراغ کی کرنیں مایوسی کے اندھیاروں میں اُمید کی روشنی
دیتی ہیں —— یہ روٹی، کپڑا اور سر چھپانے کا ٹھکانہ بہم پہنچاتا
ہے۔ بھوک سے نڈھال بچوں کے لیے دودھ فراہم کرتا ہے۔
ان کی تعلیم کے اخراجات مہیا کرتا ہے۔ بیٹی کی رخصتی کا
انتظام کرتا ہے۔
یہ چراغ ایک شفیق اور دوراندیش باپ کی نیک تمناؤں، پاکیزہ آرزوؤں اور مستقبل کے حسین
منصوبوں کی تکمیل کرتا ہے —— یہ پُرزہ کاغذ بیمۂ زندگی کی پالیسی ہے
مسلم انشورنس کمپنی لمیٹڈ
قائم شدہ ۱۹۳۴ء
لائف چیئرمین : علامہ اقبالؒ

۴۲

ایڈیٹر

محمد سلیم الرحمٰن

نذیر احمد چودھری

ترتیب

افسانے

غزلیں

نظمیں

(*) (*) (*) (*) (*) (*) (*) (*) (*) (*) (*) (*) (*)

اھتمام : مشتاق احمد چودھری
مطبع : سویرا آرٹ پریس ، ۱۵ - سرکر روڈ ، لاھور
مشین مین : محمد ایوب

سویرا

کا

اگلا " شمارہ افسانہ نمبر " ہوگا

اردو کے ان سبھی نئے پرانے افسانہ نویسوں کو یکجا
کیا جائے گا جن کی تحریر میں معنویت بھی ہے اور تازگی بھی -
یہ شمارہ محض ناموں کا پلندہ نہیں ہوگا -
ضخامت کم سلیقہ زیادہ

کمپنی کی حکومت

یہ باری علیگ مرحوم کی سب سے مشہور اور وقیع کتاب ہے
جس کو سارے برصغیر میں سراہا گیا تھا -
اس میں انگریزوں کی ہرفریب سیاست ، وحشیانہ مظالم ،
حرص وطمع اور بے اصولی کو روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیا گیا ہے -
اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان پر قبضہ کرتے ہوئے
انگریزوں نے جو مظالم ڈھائے ہیں تاریخ ان کی مثال مشکل ہی سے
پیش کرتی ہے -
مغربی سرمایہ دارانہ استعمار کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا
مطالعہ آج بھی ضروری ہے - اس کے دلائل نہایت عمدہ اور شواہد
ناقابل تردید ہیں -
یہ تازہ اشاعت اس مسودے پر مبنی ہے جسے باری مرحوم نے
خاص طور پر " نیا ادارہ " کے لیے از سرِ نو مرتب کیا تھا اور
ضخامت اور اہمیت کے لحاظ سے پچھلے دونوں ایڈیشنوں سے بدرجہا
ممتاز ہے -

حسب نسب

قرۃ العین حیدر

لمبے چوڑے سیلے ہوئے غسلخانے میں دن کو بھی اندھیرا رہتا تھا۔
پیتل کے جھال پال تنیڑے، اونچا حمام، مٹکے، رنگ برنگی
صابن دانیاں، بیسن، آبٹن، جھانوے، لوٹے، آفتابے، مگے،
کھونٹیوں پر غرارے اور میلے دوپٹوں کا انبار، آنولوں، ریٹھوں
سے بھری طشتریاں، اندھیرا خندوس موا علی بابا چالیس چور کا غار،
لیکن یہی غسل خانہ چھمی بیگم کی دکھی زندگی میں وقت بے وقت
جائے پناہ کا کام دیتا تھا۔ اسی کی ہر شیشے والی بند کھڑکی کا رخ
چنبیلی والے مکان کی طرف تھا۔ اس کے شیشے کا رنگ ناخن سے ذرا
سا کھرچ کر چھمی بیگم نے باہر جھانکنے کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔
چھمی بیگم کے لاڈلے ابن عم اجو بھائی چنبیلی والے مکان میں رہتے تھے۔
پہروں وہ اس شیشے میں سے سامنے والے گھر کو اس طرح تکتیں جیسے
شاھجہان اپنے قید خانے میں سے تاج محل کو دیکھا کرتا تھا۔

اوسط درجے کے اس زمیندار خاندان کے آبائی گھر کے دو حصے
تھے، باہر والا مردانہ، جس کے صحن چمن میں چنبیلی کی گھنی جھاڑیاں
تھیں، ''چنبیلی والا مکان'' کہلاتا تھا۔ زنانے حصے کے آنگن میں
املی کا سایہ دار درخت کھڑا تھا، اس لیے محلے دار اسے ''املی والا
مکان'' کہتے تھے۔ دونوں آنگنوں کے درمیانی دیوار میں آمد و رفت
کے لیے ایک کھڑکی تھی۔

چھمی بی کے ابا اور اجو بھائی کے ابا ایک ساتھ رہتے تھے۔
چھمی بی کی پیدا ہوتے ہی اجو بھائی سے منگنی ہو چکی تھی۔ نو
دس سال کی عمر میں منگیتر سے پردہ کرا دیا گیا تھا۔ اجو بھائی
بلا کے خوبصورت اور کھلنڈرے تھے۔ اکلوتے لاڈلے بیٹے اور دو
بھائیوں کے گھر کا واحد چراغ تھے۔ اس لیے وہ تو جی بھر کے
بگڑے۔ پتنگ بازی، کبوتر بازی، یہ بازی، وہ بازی۔ لیکن
بڑے ابا اور ابا کو اطمینان تھا کہ بیاہ ہوتے ہی سدھر جائیں گے۔
چھمی بیگم تو ہوش سنبھالتے ہی انہیں اپنے مجازی خدا سمجھنے لگی
تھیں، ماں باپ کی اکلوتی وہ بھی تھیں۔ ان کے ناز بھی کم نہ

اٹھائے جاتے - ضدی ، غصیلی اور طنطنے والی چھمی بیگم سولہ سال کی ہوئیں تو شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی - دونوں طرف دھوم دھام سے تیاریاں ہونے لگیں کہ اچانک موت نے اس سکھی اور خوش حال گھرانے کی بساط ہی الٹ دی - اس سال شاہجہانپور میں جو ہیضے کی وبا پھیلی اس میں پندرہ دن کے اندر اندر چھمی بیگم کے ابا اور اماں دونوں چٹ پٹ ہو گئے - چھمی بیگم پر قیامت گزر گئی -.لیکن ابھی تایا اور تائی کا سایہ سر پر سلامت تھا - سب سے بڑی بات یہ کہ اجو بھائی سے بیاہ ہونے والا تھا - چھمی بیگم ماں باپ کا سوگ منانے کے بعد پھر مستقبل کے سہانے خواب دیکھنے میں مصروف ہو گئیں -

شادی کچھ عرصے کے لیے ملتوی کر دی گئی تھی - لیکن اس سے پہلے کہ بڑے ابا نئی تاریخ مقرر کریں ان کا بیٹھے بٹھائے ہارٹ فیل ہو گیا -

بڑے ابا کے مرتے ہی اجو بھائی نے کہا کہ وہ چند مقدموں کے معاملات میں لکھنؤ جا رہے ہیں اور مصاحبوں کے ساتھ آڑنچھو ہو گئے - اب املی والے مکان میں رہ گئیں بڑی اماں جو بالکل باؤلی ہو رہی تھیں اور چھمی بیگم - مردانہ سونا ہو گیا - ڈیوڑھی پر پرانے ملازم دھمو خاں ڈنڈا سنبھالے بیٹھے رہ گئے - اندر سلامت بوا اور ان کی روتی لڑکیاں ناک سنکتی کھانے پکانے میں جٹی رہتیں - گھر کی حفاظت کے لیے بڑی اماں نے ایک بوڑھے رشتے دار ملن خاں کو بریلی سے بھجوا بھیجا جو چنبیلی والے مکان کے دالان میں کھٹیا ڈال کر پڑ رہے -

اجو بھائی لکھنؤ گئے تو وہیں کے ہو رہے - ہر خط میں ماں کو لکھ بھیجتے کہ تاریخ بڑھ گئی ہے - مہینے دو مہینے میں آجاؤں گا - پورے چھ مہینے بعد آئے تو بڑی اماں نے شادی کا ذکر چھیڑا - بولے : جب تک زمینوں کے معاملات نہیں سدھرتے میں شادی وادی نہیں کرنے کا - اس کے بعد پھر واپس لکھنؤ !

جبھی سے چھمی بیگم تاریک غسل خانے کے کونے میں میلے کپڑوں کے ڈھیر پر بیٹھ کر چپکے چپکے رونے لگیں -

اب چھمی بیگم انیس سال کی ہو چکی تھیں - اجو بھائی نے شاید طے کر لیا تھا کہ لکھنؤ ہی میں رہیں گے - لوگوں نے آ کر بتایا تھا کہ وہاں خوب رنگ رلیاں منا رہے ہیں - چھمی بیگم نے

جانے کیسا نصیب لے کر آئی تھیں ؟ ایک دن بڑی اماں پر دل کا دورہ پڑا اور وہ بھی چل بسیں ۔

اب چھمی بیگم تن تنہا حق حیران رہ گئیں ۔ آنگن میں آلو بولنے لگا ۔ مزید حفاظت کے خیال سے اندھے دھندے ملن خان چنبیلی والے مکان سے املی والے مکان میں منتقل ہو گئے ۔ ادھر دالان میں پڑے وہ کھانستے رہتے ۔ ڈیوڑھی میں دھمو خاں کھانستا رہتا ۔

اجو بھائی ماں کے مرنے پر آئے تھے ۔ تیجا کرتے ہی واپس چلے گئے ۔ کس طرح انھوں نے بیچ منجدھار میں چھمی بیگم کا ساتھ چھوڑا ۔ اللہ اللہ ! جب وہ سوچتیں تو کلیجہ پھٹنے لگتا ۔ مہینے کے مہینے لکھنؤ سے دو سو روپے کا منی آرڈر آ جاتا یا کبھی کبھار ملن خاں کے نام خیر خبر پوچھنے کا خط ۔

ملن خاں کی بیوی اور بیٹی بھی بریلی سے آ گئی تھیں ۔ لیکن اپنی تنک مزاجی کی وجہ سے چھمی بیگم کی ان دونوں سے ایک دن نہ بنی ۔ دن بھر ان رشتہ داروں سے لڑنے جھگڑنے یا آپ ہی آپ تلملانے اور کلسنے کے بعد چھمی بیگم پھر غسل خانے میں گھس جاتیں اور روتیں ۔ '' شاہجہانی شیشے '' میں سے چنبیلی والے مکان کو تکا کرتیں ۔ یہ زندگی بھی کیسی زندگی ہے ! وہ سوچتیں ۔ ابھی سب کچھ ہے ۔ ابھی کچھ بھی نہیں ! کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ اس گھر میں کتنی رونق تھی ، دالان میں آرام کرسیاں پڑی ہیں ۔ صحن میں مونڈھے پڑے ہیں ۔ گیس کے ہنڈے سنسنا رہے ہیں ۔ ابا اور بڑے ابا کے دوستوں کی محفل جمی ہے ۔ مشاعرے ہو رہے ہیں ۔ قوال گا رہے ہیں ۔ جب اجو بھائی کے دوست احباب آتے تو اجو آنگن والی کھڑکی میں آ کر کھنکارتے اور ایک مخصوص آواز میں آہستہ سے پکارتے '' ارے بھئی چھمو ! ذرا چائے تو بھجوا دو ۔''

اس بھرے پرے گھر کو کس کی نظر کھا گئی !

اپنی اس شدید یاس اور نا امیدی کے باوجود چھمی بیگم کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اجو واپس آئیں گے ۔ چنبیلی والا مکان پھر آباد ہو گا ۔

جمعے کے جمعے وہ مردانے مکان میں جاتیں ۔ دھمو خاں اور سلامت بوا کی لڑکیوں کے ساتھ مل کر باغ کے جھاڑ جھنکار کی صفائی کرواتیں ۔ دالان کے جالے صاف کیے جاتے ۔ اندر کے کمرے مقفل تھے ۔ دروازے کے شیشوں میں سے جھانک کر وہ بڑے ابا ،

ابا اور اجو کے کمروں پر نظر ڈالتیں اور سر ہلاتی ، ٹھنڈی آہیں بھرتی واپس آ جاتی ۔

چھمی بیگم تیس سال کی ہو گئیں ۔ بال وقت سے پہلے سفید ہو چلے ۔ اب انھوں نے چنبیلی کے باغ کی دیکھ بھال بھی چھوڑ دی ۔ دل دنیا سے اچاٹ سا ہو گیا ۔ لیکن غصے اور طنطنے کا عالم وہی رہا بلکہ اب عمر کی پختگی کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ۔

ان کی اس تمکنت اور طنطنے کے لیے وجوہات کچھ کم نہ تھیں ۔ ماں باپ خالص اصل نسل روہیلے پٹھان ۔ دادا ، پردادا ہفت ہزاری نہ سہی ، ایک ہزاری دو ہزاری (یا نگوڑے جو کچھ بھی وہ ہوتے تھے) ضرور ہی رہے ہوں گے ۔ سارے کنبے کا سرخ و سپید رنگ اور پٹھانی خود داری اور غصہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت تھا کہ اس خاندان میں کھبیل کبھی نہ ہوئی ۔ ماضی کے آن جغادری روہیلہ سرداروں کے نام لیوا اس کنبے کے حسب نسب پر کوئی آنچ نہ آنے پائے ! اس فکر میں وہ بالکل قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہیں ۔ محلے کی عورتوں سے ملنا جلنا بھی بند کر دیا ۔ بیواؤں کے سے سفید کپڑے پہننے لگیں ۔ آن کا زیادہ تر وقت مصلے پر گزرتا ۔ اکثر دوپہر کے سناٹے میں سلامت بوا آنگن کی کھڑکی میں بیٹھ کر زردہ پھانکتے ہوئے بڑی ڈراؤنی آواز میں آپ ہی آپ بڑبڑاتیں ۔ ” باری تالا فرماتا ہے ، مجھے دو وخت اپنے بندوں پر ھنسی آتی ہے ۔ ایک جب جسے میں بنا رہا ہوں اسے کوئی بگاڑنے کی کوشش کرے اور دو جب جسے میں بگاڑ رہا ہوں وہ اپنے آپ کو بنانے کی کوشش کرے ۔ بس دو وخت ۔“ اور چھمی بیگم دہل کر ڈانٹتیں ” ۔ اے سلامت بوا ! نحوست کی باتیں مت کرو ۔“ لیکن سلامت بوا اطمینان سے اسی طرح بڑبڑاتی رہتیں ۔

اس روز نوچندی جمعرات تھی ۔ چھمی بیگم غسل خانے میں نہا رہی تھیں ۔ سردیوں کا زمانہ تھا ۔ حمام کے نیچے سلگتے انگارے کب کے بجھ چکے تھے اور چھمی بیگم کو کپکپی سی چڑھ رہی تھی ۔ جلدی سے بال تولیے میں لپیٹ کر کھڑاوں پہن رہی تھیں ۔ جب باھر سے سلامت بوا کی سڑیلی نواسی نے زور سے غسل خانے کے دیمک لگے کواڑ کی کنڈی کھڑکائی ۔

” آپا ! اے آپا ! جلدی نکلو ۔“

" ارے کیا ہے ، باؤلی !" چھمی بیگم نے جھنجھلا کر آواز دی -

" آپا ! چنبیلی والے مکان میں آپ سے کہا ہے کہ چار پانچ جنوں کے لیے چائے بھجوا دو جلدی ! "

" کیا ؟ ۔ کیا ؟" چھمی بیگم کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا - انھوں نے جلدی سے " شاہجہانی شیشے " سے آنکھ لگا دی -

صحن کا پھاٹک کھلا ہؤا تھا - باہر دو تانگے کھڑے تھے دو تین لقندرے سامان اتروا رہے تھے - ایک سیاہ فام لیکن تیکھے نقشے والی عورت سرخ جارجٹ کی ساڑھی پہنے ہری بنارسی شال میں لپٹی دالان میں موڑھے پر بیٹھی اطمینان سے گھٹنے ہلا ہلا کر نوکروں کو احکام دے رہی تھیں - ایک اس کی ہم شکل تیرہ چودہ سالہ لڑی شکل والی اچھال چھکا سی لڑکی کاسنی شلوار قمیص پہنے فرش پر اکڑوں بیٹھی ایک بکس کھولنے میں مشغول تھی - اتنے میں اندر سے اجو بھائی ۔ جی ہاں ۔ ہمیشہ کی طرح بانکے چھیلے اجو بھائی دالان میں آئے - جھک کر اس لال چڑیل سے کچھ کہا - وہ قہقہہ لگا کر ہنسی - چھمی بیگم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا - نیم تاریک غسل خانہ اب بالکل ہی اندھا کنواں بن گیا ! انھوں نے جلدی سے ایک کھونٹی پکڑی - لڑکھڑاتی ہوئی باہر آئیں اور بے سدھ سی ہو کر اپنے بستر پر گر گئیں -

بات یہ تھی کہ اجو بھائی جنھوں نے برسوں سے لکھنؤ والی کلو کو گھر میں ڈال رکھا تھا ، اب باقاعدہ نکاح کر کے اسے اپنے ساتھ لے آئے تھے - کاسنی شلوار والی لڑکی اشرفی ، کلو اپنے ساتھ لائی تھی - اجو بھائی کی نہیں تھیں -

شام کو اجو بھائی پردہ کروائے بغیر درانہ زنانہ میں چلے آئے اور دالان میں پہنچ کر پکارا " ارے بھئی چھمو - آؤ - اپنی بھابی سے مل لو !"

چھمی بیگم کانپ کر رہ گئیں - پلنگ سے اٹھ کر پھر غسل خانے میں جا گھسیں اور زور سے چٹخنی چڑھا دی - اجو بھائی ذرا چور سے بنے دالان کے ایک در میں کھڑے رہے - کلو ان کے پیچھے کھڑی تھی - دونوں میاں بیوی چند منٹ تک اسی طرح چپ چاپ کھڑے رہے اور پھر سر جھکائے چنبیلی والے مکان میں واپس چلے گئے -

اس دن کے بعد سے چھمی بیگم کی دنیا بدل گئی - اب وہ سارا

دن قرآن شریف ہی پڑھا کرتیں ۔ اجو نے انہیں اتنے برسوں سے ہوا میں معلق رکھ کے ، ان کی زندگی تباہ کر کے کسی اور سے شادی کر لی ، اس ناقابل برداشت صدمے سے زیادہ دہشت انہیں اس بات کی تھی کہ انھوں نے کلو بائی طوائف سے شادی کر کے خاندان کا حسب نسب برباد کر دیا! چھمی بیگم اس جرم کے لیے انہیں مرتے دم تک معاف نہیں کر سکتی تھیں ۔ کلو نے کئی بار آن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ۔ اکثر وہ آنگن کی کھڑکی میں آ کر آہستہ سے کہتی : ” بٹیا کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجیے ۔“ کبھی کوئی خاص کھانا پکتا تو نوکر کے ہاتھ سینی میں بھجواتی ۔ لیکن چھمی بیگم نے دھمو خاں کو حکم دے رکھا تھا کہ چنبیلی والے مکان سے کوئی چڑیا کا بچہ بھی اس طرف آئے تو اس کی ٹانگیں توڑ دو ۔ گھر واپس آنے کے بعد دوسرے مہینے اجو بھائی نے ملن خاں کے ہاتھ دو سو روپے بھجوائے جو وہ اب تک لکھنو سے بھیجا کرتے تھے لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی ۔

چھمی بیگم کھڑکی میں جا کر للکاریں : ” جمعہ خاں مرحوم کی بیٹی اور شبو خاں مرحوم کی بھتیجی چکلے سے آیا ہؤا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر حرام سمجھتی ہے ! ملن خاں! غیرت والے پٹھان ہو تو جا کر یہ دو سو روپے بھیجنے والوں کے منہ پر دے مارو!“ یہ رجز پڑھ کر انھوں نے کھڑکی کا دروازہ بند کر لیا اور اس میں موٹا قفل ڈال دیا ۔

اب چھمی بیگم اپنے زیور بیچ کر گزر بسر کرنے لگیں ۔ زیور ختم ہو گئے تو گھر کا قیمتی پرانا سامان کباڑی کے ہاتھ فروخت کر ڈالا ۔ لیکن بھوک ایک دائمی مرض ہے جس کا وقتی علاج کافی نہیں اور چھمی بیگم کو دھمو خاں ، ملن خاں ، سلامت بوا اور ان کے چینگڑ پوتوں کا پیٹ بھرنا تھا ۔ انھوں نے گھر میں قرآن شریف اور اردو پڑھانے کے لیے بچیوں کا مکتب کھول لیا ۔ محلے والوں کی سلائی کرنے لگیں ۔ جب محنت کرتے کرتے بیمار پڑ گئیں اور ہلہلا کر بخار چڑھ آیا تو سلامت بوا ہڑ بڑا گئیں اور غصے سے بولیں : ” بی بی ! کیا آن پر جان دے دو گی ؟ ایسی بھی کیا نگوڑی آن !“ لیکن چھمی بیگم پر غنودگی طاری تھی ۔ سلامت بھاگی بھاگی چنبیلی والے مکان پہنچیں ۔

کلو فوراً سر پر برقع ڈال گلی کے راستے اندر آئی ۔ ڈاکٹر بلایا

گیا ۔ کلو ساری رات نند کی پٹی سے لگی بیٹھی رہی ۔ اجو بھائی نے کئی بار آ کر دکھیاری چچا زاد بہن کی حالت دیکھی ۔ لیکن شاید اب بھی اس بے انصافی کا احساس انھیں نہ ہؤا جو انہوں نے چھمی بیگم کے ساتھ کی تھی کیونکہ بقول سلامت بوا اس کالی کلوٹی کلو نے انھیں الو کا گوشت کھلا رکھا تھا ۔

چھمی بیگم کو جونہی ہوش آیا ، آنکھیں کھولیں اور کلو کا متفکر چہرہ سامنے دیکھا اُن پر غم و غصہ کا بھوت پھر سوار ہو گیا ۔ کلو ان کے پٹھانی جلال سے بے حد خوفزدہ تھی ۔ فوراً کان دبا کر اپنے گھر واپس بھاگ گئی ۔

بیشتر طوائفوں کی طرح جو شادی کر کے بے حد وفا شعار بیویاں ثابت ہوتی ہیں کلو بھی بڑی پتی ورتا عورت تھی ۔ اس کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ چھمی بیگم اُسے کنبے کی بہو اور اپنی بھاوج سمجھ کر املی والے مکان میں داخل کر لیں ۔ اس کی یہ تمنا کبھی نہ پوری ہوئی ۔

دس سال نکل گئے ۔ اجو بھائی کو چھمی بیگم کے رشتے کی بھی فکر تھی ۔ لیکن چھمی بیگم ادھیڑ ہو چکی تھیں ۔ اب ان سے شادی کون کرے گا ؟

چھمی بیگم اُن سے اور کلو سے اُسی طرح شدید پردہ کرتی تھیں ، اُسی طرح مدرسہ چلا کر گزر کر رہی تھیں کہ ملک تقسیم ہو گیا ۔ آدھا شاہجہانپور سمجھو خالی ہو گیا ۔ اُن کے مکتب کی ساری لڑکیاں اپنے اپنے ماں باپ کے ساتھ پاکستان چلی گئیں ۔ چھمی بیگم کے ہاں روٹیوں کے لالے پڑ گئے ۔ اُسی زمانے میں شامت اعمال کہ کسی کام سے اجو بھائی دلی گئے اور فسادوں میں وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ جب ان کی سناؤنی آئی ہے کلو پچھاڑیں کھانے لگی ۔ چوڑیاں توڑ ڈالیں ۔ آنگن کی کھڑکی پر مکے مار مار کر ہاتھ لہو لہان کر لیے ۔ ” بٹیا ! — بٹیا ! دروازے کھولیے — ہائے بٹیا ، بٹیا — ارے میں کہیں کی نہ رہی ! “

چھمی بیگم دالان کے تخت پر بے خبر سو رہی تھیں ۔ بین سن کر جاگ اٹھیں ۔ گھبرا کر دیوار کی کیل سے ٹنگی کنجی اتاری ۔ تالا کھولا ۔ کلو بال بکھرائے بھتنی کی طرح کھڑی چیخ رہی تھی ۔ ” ارے لوگو ! میرا سہاگ لٹ گیا ! ہائے بٹیا ، میری مانگ اُجڑ

گئی !" اس نے آگے بڑھ کر چھمی سے لپٹنا چاہا ۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئیں ۔ نیند سے بوجھل آنکھیں ملیں اور اچانک ان کی سمجھ میں بات آ گئی ۔ تب وہ بھی کھڑکی میں بیٹھ گئیں ۔ سفید دوپٹہ منہ پر رکھ لیا ۔ سسک سسک کر رونے لگیں اور روتے روتے بولیں ۔ " اری مردار ! تو تو آج بیوہ ہوئی ہے ۔ میں بدبخت تو سدا کی بیوہ ہوں ۔"

اجو بھائی کے چہلم کے بعد ہی کلو نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ۔ اس کی لڑکی اشرفی کا چند سال پہلے اجو بھائی مرحوم نے اپنے کسی مصاحب سے نکاح کروا دیا تھا ۔ وہ لکھنؤ سے آئی ۔ چنبیلی والے مکان کے سازو سامان پر قبضہ کیا اور سب چیزیں چھکڑوں پر لدوا کر چلتی بنی ۔ چھمی بیگم غسل خانے کے شیشے میں سے بے نیازی کے ساتھ فانی دنیا کے یہ سارے تماشے دیکھتی رہیں ۔

چنبیلی والے مکان پر کسٹوڈین کا تالا پڑ گیا کیوں کہ چھمی بیگم عدالت میں یہ کسی طرح ثابت نہ کر پائیں کہ اجو بھائی پاکستان نہیں گئے بلکہ بلوے میں مارے گئے ہیں ۔ خود کسی پرانے آسیب کی طرح وہ املی والے مکان میں موجود رہیں ۔ ملن خاں اور دھمو خاں بڑھاپے اور فاقہ کشی کی وجہ سے مر گئے ۔ سلامت بوا پر فالج گر گیا ۔ ان کی لڑکیاں اور داماد پاکستان چلے گئے ۔ چھمی بیگم سلائی کر کے پیٹ پالتی رہیں ۔ تن تنہا مکان میں رہتے اب انہیں ڈر نہیں لگتا تھا کیونکہ سر سفید ہو چکا تھا ۔ بہت جلد محلے کی بڑی بوڑھی کہلائیں گی ۔

کچھ عرصے بعد چنبیلی والے مکان میں ایک سکھ شرنارتھی ڈاکٹر آن بسے ۔ کبھی کبھی سردارنیاں آنگن کی کھڑکی میں آ بیٹھتیں اور وہ اور چھمی بیگم اپنے دکھ سکھ کی باتیں کرتیں ۔ ڈاکٹر صاحب کی لڑکی چرنجیت کی شادی نئی دھلی میں کسی سرکاری افسر سے ہوئی تھی ۔

اب کی بار وہ میکے آئی تو اس نے اپنی ماں سے کہا کہ اس کے شوہر کے مسلمان افسر اعلیٰ کی بیگم کو استانی کی ضرورت ہے جو گھر پہ رہ کر ان کے بچوں کو اردو اور قرآن پڑھائے ۔ " میں تو چھمی ماسی سے کہتے ڈرتی ہوں ۔ انہیں جلال آ جائے گا ۔ آپ کہہ کر دیکھیے ۔"

بڑی سردارنی نے چھمی بیگم سے اس ملازمت کا ذکر کیا ۔

سمجھایا ، بجھایا ۔ ”بہن جی ! اس تنگدستی اور تنہائی میں کب تک بسر کرو گی ۔ دلی چلی جاؤ ۔ صبیح الدین صاحب کے ہاں عزت و آرام سے بڑھاپا کٹ جائے گا ۔“

چھمی بیگم کا غصہ کب کا دھیما پڑ چکا تھا ۔ جوش و خروش، طنطنے اور جلال میں کمی آ گئی تھی ۔ ان کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی کہ اگر کل کلاں کو مر گئی تو آخر وقت میں یسین شریف پڑھنے والا تو کوئی ہونا چاہیے ۔

قصہ مختصر یہ کہ چھمی بیگم برقع اوڑھ صرف ایک بکس اور بستر اور لوٹا ساتھ لے کر گھر سے نکلیں جو اب تک بالکل کھنڈر ہو چکا تھا اور جس کے کھنڈر ہونے کا اب انہیں قطعی غم نہ تھا ۔ کیونکہ وہ تیاگ اور سنیاس کی سٹیج پر پہنچ چکی تھیں ۔ وہ ریل میں بیٹھ کر دلی پہنچیں جہاں ریلوے سٹیشن پر بے چاری بیگم صبیح الدین چرنجیت سندر سنگھ کا خط ملنے پر کار لے کر خود انہیں گھر لے جانے کے لیے آ گئی تھیں ۔

اس روز سے چھمی بیگم بنت جمعہ خاں زمیندار شاہجہان پور ”مغلانی بی“ بن گئیں ۔

چھمی بیگم نے پورے بارہ سال سفید براق دوپٹہ ماتھے سے لپیٹے صبیح الدین صاحب کے گھر میں گزار دیے ۔ بچے جنہیں وہ قرآن شریف اور اردو پڑھانے آئی تھیں بڑے ہو گئے ۔ بڑا لڑکا بی اے کے بعد اپنے چچا کے پاس پاکستان بھیج دیا گیا ۔ منجھلی لڑکی بھی کراچی چلی گئی ۔ چھوٹی لڑکی کالج پہنچ گئی ۔ اب بیگم صبیح الدین کو چھمی بیگم کی ضرورت نہیں تھی ۔ صبیح الدین صاحب ریٹائر ہو کر اپنے وطن مرزا پور جانے والے تھے ۔ دلی سے روانہ ہونے سے پہلے بیگم صبیح الدین نے چھمی بیگم کو اپنی دوست بیگم راشد علی کے ہاں رکھوا دیا ۔ راشد علی صاحب بھی حکومت ہند کے اعلیٰ افسر تھے ۔

چھمی بیگم صبیح الدین صاحب کے ہاں بہت سکھ چین سے رہی تھیں ۔ ان سے گھر کے بزرگوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا ۔ انہیں تینوں بچوں سے بے حد محبت ہو گئی تھی ۔ غصہ بھی بہت کم آتا تھا ۔ اگر آتا بھی تو اپنی مجبوریوں کا خیال کر کے پی جاتی تھیں ۔ اب وہ تیہا دکھاتیں بھی کس پر ۔ ناز اٹھانے ، خفگی برداشت کرنے والے سب اللہ کو

پیارے ہو چکے تھے - کبھی کبھی انہیں کلو کا خیال بھی آ جاتا اور سوچتیں نہ جانے کمبخت اب کہاں اور کس حال میں ہوگی یا شاید وہ مر کھپ گئی ہو - آج کل زندگیوں کا کیا بھروسہ ہے -

بیگم راشد علی بیگم صبیح الدین کی طرح درد مند اور دیندار خاتون تو نہ تھیں آج کل کی ماڈرن لڑکی تھیں لیکن عزت انہوں نے بھی چھمی بیگم کی بہت کی - یہاں بھی وہ گھر کے فرد کی حیثیت سے رہتیں - راشد علی صاحب ان کا بہت خیال رکھتے - ان کی بارعب، پروقار شکل و صورت اور اعلیٰ نسبی سے بہت ہی متاثر تھے - بیگم راشد اکثر سہیلیوں سے کہتیں - ''بھئی واقعی زندگیوں میں کیسے کیسے انقلاب آتے ہیں - پل کی پل میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے - ہماری مغلانی بی کا قصہ سنا ہے آپ نے؟ یہ شاہجہان پور کے فلاں خاندان -'' اور سننے والی خواتین سر ہلا کر ٹھنڈی سانس بھرتیں اور دوسرے اسی طرح کے عبرت انگیز نصیحت آموز واقعات سناتیں -

بیگم راشد علی کے بچے بہت خورد سال تھے - ان پر حیدرآبادی ''آیا ماں'' مامور تھی - چھمی بیگم ہاؤس کیپر بن گئیں - گھر سنبھالنے کے لیے بیگم راشد کو چھمی بیگم کی بے حد ضرورت تھی کیوں کہ ان کا اپنا وقت زیادہ تر کلبوں، پارٹیوں اور سرکاری تقریبات میں گزرتا تھا -

پانچ برس چھمی بیگم نے راشد علی صاحب کے گھر میں بھی کاٹ دیے - جب راشد صاحب کا تبادلہ ہندوستانی سفارت خانہ واشنگٹن ہونے لگا تو ان کی بیگم کو فکر ہوئی کہ چھمی بیگم کا کہیں اور ٹھکانہ بنائیں -

ایک دن وہ اپنے ایک الوداعی لنچ کے لیے روشن آرا کلب گئی ہوئی تھیں اور چھمی بیگم سے کہتی گئی تھیں کہ فلاں وقت کار لے کر منی کو میرے پاس لے آئیے گا -

جب چھمی بیگم روشن آراء کلب پہنچیں لنچ ابھی ختم نہ ہوا تھا - چھمی بیگم بچے کی انگلی پکڑے سبزے پر ٹہلتی رہیں -

چھمی بیگم اب پردہ نہیں کرتی تھیں اور ساری پہنتی تھیں - اس نگوڑی دلی میں انہیں پہچاننے والا اب کون تھا - سامنے برآمدے میں ایک طرف رمی کی محفل جمی ہوئی تھی اور ایک بے حد فیشن ایبل چالیس، پنتالیس سالہ حقاقہ وقاقہ خاتون پانچ چھ مردوں کے ساتھ قہقہے لگا لگا کر تاش کھیلنے میں مصروف تھیں -

سترہ برس نئی دلی میں رہ کر چھمی بیگم اس نئی اعلیٰ سوسائٹی اور جدید ہندوستانی خواتین کی الٹرا ماڈرن طرز زندگی کی بھی عادی ہو چکی تھیں - اس لیے چھمی بیگم اطمینان سے گھاس پر ٹہلنے لگیں -

چند منٹ بعد اس خاتون نے سر اٹھا کر چھمی بیگم کو ذرا غور سے دیکھا - کچھ دیر بعد نظر ڈالی اور اپنے ایک ساتھی سے کچھ کہا -

تب چھمی بیگم نے دیکھا ، ایک مردوا تاش کی میز سے اٹھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہؤا ان کی طرف آ رہا تھا -

قریب آ کر اس نے کہا : ’’ بڑی بی ، ذرا ادھر آئیے -‘‘

چھمی بیگم متانت سے برآمدے میں پہنچیں - اجنبی خاتون نے پوچھا ، یہ بچی کس کی ہے اور وہ کس کی ملازمہ ہیں ؟ چھمی بیگم نے بتایا - خاتون نے کہا کہ وہ بمبئی میں رہتی ہیں اور آج کل انہیں بھی ایک قابل اعتبار بڑی بی کی تلاش ہے ، اگر وہ اپنی جیسی کسی بڑی بی کو جانتی ہوں تو بتائیں - چھمی بیگم فوراً دل میں اس رب کریم کا لاکھ لاکھ شکر بجا لائیں جو رزق کا ایک دروازہ بند کرتا ہے تو دوسرا کھول بھی دیتا ہے - پھر انہوں نے اسی وقار سے جواب دیا کہ وہ خود بہت جلد اپنی موجودہ ملازمت سے سبکدوش ہونے والی ہیں - ’’ میری بیگم ابھی باہر آتی ہوں گی آن سے بات کر لیجیے -‘‘ اتنا کہہ کر وہ بیگم راشد کے انتظار میں وہیں برآمدے کے ایک در میں ٹک گئیں -

جب بیگم راشد لنچ روم سے نکلیں تو میز سے اٹھ کر اجنبی خاتون نے فوراً اپنا تعارف کرایا - اپنا نام مسز رضیہ بانو بتایا اور چھمی بیگم کے متعلق ان سے بات کی - بیگم راشدہ بھی بہت خوش ہوئیں اور وعدہ کیا کہ واشنگٹن روانہ ہونے سے پہلے وہ چھمی بیگم کو خود بمبئی کی ریل گاڑی میں بٹھا دیں گی - رضیہ بانو نے بتایا تھا کہ وہ آج شام ھی بمبئی واپس جا رہی ہیں - اپنے گھر کا پتہ لکھ کر انہوں نے چھمی بیگم کو دے دیا - لیکن بیگم راشد نے ذرا متفکر ہوکر چھمی بیگم سے پوچھا -’’ خالہ ، تم اکیلی اتنی دور کا سفر کر لو گی ؟‘‘ چھمی بیگم نے فوراً اقرار میں سر ہلا دیا - چھمی بیگم کو اب زندگی میں کسی بات کے لیے ’’ نہیں ‘‘ کہنے کی ضرورت ھی نہ رہی تھی - انہوں نے رضیہ بانو سے تنخواہ کا فیصلہ بھی نہ کیا کیونکہ انہوں نے ہمیشہ کے لیے ایک ھی تنخواہ اپنے لیے مقرر کر لی تھی - چالیس روپے ماہوار اور کھانا - یہ چالیس روپے آن کی ذاتی

ضروریات کے لیے ضرورت سے زیادہ تھے ۔

کپڑے ہمیشہ انہیں اپنی بیگموں سے مل جاتے تھے ۔ عرصہ ہؤا انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ کپڑے لتے ، گہنے پاتے ، جائداد املاک ، رشتے ناطے ، دوستی محبت سب بے معنی اور فانی چیزیں ہیں ۔

بیگم راشد علی اور چھمی بیگم برآمدے سے اترنے لگیں تو رضیہ بانو نے فوراً بیگ کھول کر ڈیڑھ سو روپے کے نوٹ نکال کر چھمی بیگم کے حوالے کر دیے ۔ ''سفر خرچ اور دوسرے اخراجات ۔'' انہوں نے ذرا بے پروائی سے کہا ۔ بیگم راشد کو آن کی اس دریا دلی پر حیرت ہوئی لیکن انہیں خود معلوم تھا کہ بمبئی میں ایک سے ایک بڑی سیٹھانی ہوتی ہے ۔ چھمی بیگم نے خاموشی سے نوٹ صدری کی جیب میں اڑوس لیے۔ انہوں نے اب زندگی کے انوکھے واقعات پر متعجب ہونا بھی چھوڑ دیا تھا ۔

مسٹر و مسز راشد علی کے امریکہ روانہ ہونے سے دو دن پہلے چھمی بیگم نے بھی ٹرین میں سوار ہو کر بمبئی کا رخ کیا ۔

بمبئی سنٹرل پہنچ کر وہ پہلی بار ذرا گھبرائیں کیونکہ نئی دلی کی پرسکون کوٹھیوں میں انہوں نے اب تک بہت محفوظ اور مامون زندگی گذاری تھی ۔ اللہ کا نام لے کر پلیٹ فارم سے باہر نکلیں ۔ قلی کے سر سے اپنا ٹین کا بکسا اور دری میں لپٹا بستر آتروایا ۔ اپنا لوٹا ، دستی پنکھا اور پندنیا ہاتھوں میں سنبھال کر ٹیکسی کی ۔ سردار جی کو پتہ بتایا ۔ ''گلزار ۔ جارڈن روڈ ۔''

چند منٹ میں ٹیکسی ایک بلند و بالا نئی عمارت کی برساتی میں جا رکی ۔ چھمی بیگم نے بوڑھے سردار جی کو کرایہ دیا ۔ جو راستے میں ان سے دنیا کے حالات پر تبادلۂ خیالات کرتے آئے تھے ۔

اسی وقت دو بےحد اسمارٹ لڑکیاں لفٹ سے نکل کر سردار جی کی ٹیکسی میں بیٹھ گئیں ۔ سردار جی نے خاموشی سے فلیگ گرایا اور پھاٹک سے باہر نکل گئے ۔ کس قدر غیر شخصی ، منظم اور مکنیکل زندگی اس شہر کی تھی ۔

چھمی بیگم نے صدری کی جیب سے میلا کاغذ کا ٹکڑا نکال کر پھر آنکھیں چندھائیں اور پتہ پڑھا ۔ گیارھویں منزل ۔ فلیٹ نمبر ۳ ۔ اسٹول پر بیٹھے چوکیدار نے اکتائے ہوئے انداز میں خاموشی سے اٹھ کر ان کا سامان لفٹ میں رکھ دیا۔ لفٹ آٹومیٹک تھا۔ چھمی بیگم بہت

گھبرائیں ۔ چوکیدار جلدی سے اندر آیا اور انہیں گیارھویں فلور تک پہنچا کر واپس نیچے چلا گیا ۔ اب چھمی بیگم اپنے سامان سمیت طویل گیلری میں اکیلی کھڑی تھیں ۔ پھر ان کی نظر ایک نزدیکی دروازے پر پڑی جس کے اوپر نمبر ۳ لکھا تھا ۔ دروازے پر ایک اور آہنی جالی دار دروازہ چڑھا تھا جو اندر سے مقفل تھا ، جیسے بنکوں کے دروازے ہوتے ہیں ۔ چھمی بیگم نے آگے بڑھ کر گھنٹی بجائی ۔ چند لحظوں بعد ایک بھوری آنکھ نے اندرونی کواڑ کی جالی دار سوراخ کا پٹ ہٹا کر جھانکا ۔ چھمی بیگم کو دفعةً برسوں بعد اپنے غسل خانے کی کھڑکی کا کھرچا ہؤا شیشہ یاد آگیا ۔ جس میں انہوں نے پہلی بار اس منحوس لال چڑیل کو دیکھا تھا جو ان کے بھرے پرے کنبے کو چٹ کر گئی ۔ مزید توقف کے بعد دونوں دروازے کھلے اور ایک غصیلا سا گورکھا باہر نکلا ۔ اس نے مشکوک اور بے رحم نظروں سے چھمی بیگم کو دیکھا ۔ چھمی بیگم ڈر سی گئیں لیکن پھر یاد آیا وہ بھی پٹھان ہیں ۔ سر اٹھا کر وقار سے کہا :

" بیگم صاحب سے کہو چھمی بیگم دلی سے آگئی ہیں ۔"

" مالوم ہے تم دلی سے آیا ہے ۔ اندر آ جاؤ ۔" گورکھے نے خشکی سے جواب دیا اور باہر نکل کر ان کا بکس اور بستر اٹھایا ۔ اس کے پیچھے پیچھے چھمی بیگم اندر آ گئیں تو اس نے کھٹ سے دونوں دروازے مقفل کر دیے ۔

اب چھمی بیگم ایک نیم تاریک ، ایر کنڈیشنڈ ، بے حد عالیشان ڈرائینگ روم میں کھڑی تھیں ۔ ایسا شاندار ڈرائینگ روم تو نہ بیچارے صبیح الدین صاحب کا تھا اور نہ ہی راشد علی صاحب کا ۔ ایک طرف کی دیوار پر سیاہ پردہ پڑا تھا ۔ جو ذرا سا سرکا ہؤا تھا اور اس کے پیچھے دیوار میں نصب سنیما کی چھوٹی سی سکرین نظر آ رہی تھی ۔ کمرے کے دوسرے حصے میں بار تھی ۔

" بیگم صاحبہ ہیں ؟" چھمی بیگم نے دونوں ہاتھوں میں لوٹا ، پندنیا اور پنکھا اٹھائے دریافت کیا ۔

" میم صاحب سو رہا ہے ۔"

" اور صاحب ؟" ملازمت شروع کرنے سے پہلے گھر کے صاحب کے انٹرویو سے وہ ہمیشہ جھجکتی تھیں ۔

گورکھے نے کوئی جواب نہ دیا اور ڈرائنگ روم سے نکل کر ایک گیلری کی طرف چلا ۔ چھمی بیگم اس کے پیچھے پیچھے دونوں

طرف دیکھتی ہوئی ۔ گیلری میں دو رویہ چار دروازے تھے جو سب اندر سے بند تھے ۔

آگے جا کر گیلری بائیں طرف کو مڑ گئی ۔ یہاں باورچی خانہ اور نوکروں کے دو مختصر سے کمرے تھے ۔ جن کے باہر بالکنی تھی ۔ نوکروں کے استعمال والے زینے میں بھی اندر سے تالہ پڑا تھا ۔ ایک صاف ستھری اور روشن خالی کوٹھڑی میں جا کر گورکھے نے بکس بسترا دھم سے زمین پر رکھ دیا اور اسی طرح چپ چاپ باہر چلا گیا ۔

چھمی بیگم نے پندنیا بڑے طاق کے تختے پر رکھ کر اپنی نئی جائے پناہ ، نئے ٹھکانے پر نظر ڈالی ۔ کونے میں لوہے کا ایک پلنگ پڑا تھا ۔ انھوں نے دل میں سوچا یہ بہت چبھے گا ۔ دیواروں پر پچھلے شوقین مزاج ملازم کی چپکائی ہوئی فلم ایکٹرسوں کی تصویریں مسکرا رہی تھیں ۔ کوٹھڑی میں حبس طاری تھا ۔ چھمی بیگم نے کھڑکی کھولی تو اچانک سمندر آنکھوں کے سامنے آ گیا ۔ نیلا ، وسیع ، بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مارتا ، غیر متوقع ، زندگی کے واقعات کی مانند اچانک ! انھوں نے سمندر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ دفعتاً خیال آیا اس کارساز کے قربان جاؤں ۔ سمندر تک پہنچ گئی ۔ اب انشاء اللہ حج بھی کر آؤں گی ۔ اسی سمندر کے اس پار مکہ مدینہ ہے ۔ یہ سوچ کر ان کا جی بھر آیا ۔

کوٹھڑی سے ملحق نوکروں کا غسل خانہ تھا ۔ چھمی بیگم نے بکسا کھولا ، کپڑے نکالے ، غسل خانے میں گئیں ۔ اپنے آبائی مکان کا وہ طویل و عریض ، نیم تاریک غسل خانہ ، مامائیں اصیلیں ، وہ برسوں کی کوشش کے بعد بھلا چکی تھیں کہ انسان پیہم تبدیلیوں کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے ورنہ مر جائے ۔

نہا دھو ، کپڑے بدل وہ پھر اپنی کوٹھڑی میں آئیں ۔ سارا گھر سنسان پڑا تھا ۔ نوکر نہ چاکر ۔ صاحب دفتر گئے ہوں گے ، بچے اسکول ۔ میم صاحب سو رہی تھیں ۔ دوپہر کا وقت تھا ۔ اب انھیں چائے کی طلب ستانے لگی ۔ ساری عمر شدید ذہنی اور جذباتی صدمے سہتے رہنے سے چھمی بیگم کی تیزی طراری کب کی ہوا ہو چکی تھی اور وہ بڑھاپے کی وجہ سے ستری بہتری بھولی بھگی ہو کر رہ گئی تھیں ۔ سادگی سے سوچا اب کچن میں جا کر چائے بنا لوں ۔

سنسان باورچی خانے میں پہنچیں تو وہاں گیس کے چولہے نظر

آئے جو استعمال کرنا نہ جانتی تھیں ۔ ذرا جھنجھلا کر گیلری میں آئیں ۔ جس کے چار دروازوں میں سے ایک اب کھل چکا تھا اور اس پر پڑا بیش قیمت پردہ دکھائی دے رہا تھا ۔

اُن کے پردے کی چاپ سن کر پردے کے پیچھے سے کسی نے آواز دی ۔ "کون ہے ؟"

"چھمی بیگم — دلی سے آئی ہوں ۔" انہوں نے اسی سادگی سے جواب دیا ۔

"اوہو ۔ آگئیں ۔ آ جاؤ ۔"

یہ پردہ سرکا کر اندر آگئیں ۔ ایک بالکل شاہانہ خواب گاہ میں وسیع و عریض امریکن چھپرکھٹ پر رضیہ بانو گلابی رنگ کا نائیلون کا نائٹ گون پہنے نیم دراز تھیں ۔ انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا ۔ چھمی بیگم کو ان کا یہ ننگا پہناوا ذرا بھی پسند نہ آیا لیکن سوچا بھئی اپنا اپنا دستور ہے ۔ اس شہر کے ہی رنگ ڈھنگ ہیں ۔ رضیہ بانو کا سگریٹ بھی انہیں اچھا نہ لگا ۔ بیگم صبیح الدین اور بیگم راشد دونوں سگریٹ نہیں پیتی تھیں ۔ بہرحال انہوں نے بردباری سے کہا : "سلام علیکم ۔"

"آجاؤ ، بوا ۔ بیٹھو ۔" رضیہ بانو نے فرش کی طرف اشارہ کیا ۔

جب سے چھمی بیگم برقع سر پر ڈال کر حق حلال کی روزی کمانے باپ دادا کی دھلیز سے باہر نکلی تھیں آج تک انہیں کسی نے بوا نہیں کہا تھا ۔ صبیح الدین صاحب اور راشد صاحب دونوں کے ہاں انہیں چھمی خالہ یا صرف خالہ کہہ کر پکارا جاتا تھا ۔ وہ تمکنت سے دیوان کے کنارے پر ٹک گئیں ۔

رضیہ بانو کے سرھانے دو ٹیلیفون رکھے تھے ۔ ایک سفید ، ایک سرخ ۔ سفید والے کی گھنٹی بجی ۔ رضیہ بانو نے ریسیور اٹھا کر انگریزی میں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کیں ۔ ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل سے ایک بڑی سی مجلد نوٹ بک اٹھائی ۔ اس میں کچھ لکھا ۔ پھر ریسیور رکھ کر سرخ رنگ کے ٹیلیفون کا ایک نمبر ملایا اور آہستہ سے کہا ۔ "مادھو — چار نمبر ، نائن تھرٹی" اور فون بند کر دیا ۔

چھمی بیگم خاموش بیٹھی آرائش دیکھتی رہیں ۔ مرمریں مجسمے ، بڑی بڑی تصویریں ، ریڈیوگرام ، طول طویل سفید رنگ کا وارڈروب ۔ اتنے میں پردہ سرکا ، ایک طرحدار لڑکی ہاؤس کوٹ پہنے اندر آئی ۔ گیلری کے بند دروازوں میں سے ایک کھلا ۔ کمرے میں زور سے

(HI-FI) '' ھائی فائی '' کی آواز سنائی دی ۔ لڑکی نے رضیہ بانو سے کچھ گٹ مٹ کی ۔ آلٹے پاؤں واپس گئی اور گیلری والا دروازہ پھر بند ہو گیا ۔

'' اللہ رکھے کتنے بچے ہیں ؟ '' چھمی بیگم نے دریافت کیا ۔

'' میرے ہاں کوئی اولاد نہیں ۔ یہ میری بھانجیاں میرے ساتھ رہتی ہیں ۔'' رضیہ بانو نے مختصراً جواب دے کر پھر مجلد نوٹ بک کھول لی ۔

'' کالج میں پڑھتی ہوں گی '' چھمی بیگم نے کہا ۔

'' کون ؟ '' رضیہ نے بے خیالی سے پوچھا ۔

'' بھانجیاں آپ کی ۔''

'' ہوں ! ''

'' اللہ رکھے آپ کے میاں بزنس کرتے ہیں ؟ '' چھمی بیگم کو معلوم تھا کہ بمبئی میں سب لوگ بزنس کرتے ہیں ۔

'' ہیں ؟ — کیا ؟ '' رضیہ بانو نے نوٹ بک سے سر اٹھا کر ذرا ناگواری سے پوچھا ۔ '' میاں ؟ — میاں مر گئے ۔''

'' انا للہ و انا الیہ راجعون ۔'' چھمی بیگم کے منہ سے نکلا ۔ لحظے بھر کے لیے اجو بھائی اللہ بخشے کی موت کا زخم پھر ہرا ہوگیا ۔ ہر موت کی خبر پر ہرا ہو جاتا تھا ۔ کوئی کیا جان سکتا تھا کہ چھمی بیگم نے اپنی ساری عمر کیسے بے پایاں اندوہ میں مبتلا رہ کر اسے کس طرح ضبط کر کے گذار دی ۔ صبر ، شکر ! صبر ، شکر !

چوڑی دار پاجامہ پہنے ایک اور مجسم قیامت نوجوان لڑکی لہراتی بل کھاتی کمرے میں آئی ۔ رضیہ بانو نے اس سے انگریزی میں کچھ کہا ۔ لڑکی اسی طرح لہراتی مسکراتی باہر چلی گئی ۔ اب رضیہ بانو چھمی بیگم کی طرف متوجہ ہوئیں جنہیں چائے کی طلب میں جمائیاں آنے لگی تھیں ۔ رضیہ بانو نے ایک تکیہ کہنیوں کے نیچے دبا کر کہنا شروع کیا ۔ '' بوا ! (چھمی بیگم پھر کلبلائیں) آپ نے بہت اچھا کیا جو میرے ہاں آ گئیں ۔ میں نے پہلی نظر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ بے سہارا اور دکھی ہیں ۔ اب آپ اس گھر کو اپنا گھر سمجھیے ۔ میں ہمیشہ یہ چاہتی ہوں کہ کوئی بزرگ بی بی میرے ہاں رہیں ۔ بڑا سہارا سا رہتا ہے ۔ میں چاہتی ہوں کوئی بزرگ بی بی میرے گھر میں نماز قرآن پڑھتی رہا کریں ۔ برسوں سے میرے پاس ایک حیدر آبادی بڑی بی تھیں ۔ وہ پچھلے سال بیچاری حج کرنے گئیں تو وہیں

انتقال ہوگیا۔ اچھا۔'' رضیہ بانو نے پہلو بدل کر بات جاری رکھی۔ ''میں اب آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں ہوا کہ یہ بمبئی شہر میدان حشر ہے۔ طرح طرح کی باتیں، طرح طرح کے لوگ۔ آپ کسی بات پر کان نہ دھریے۔ بس اپنے کام سے کام رکھیے۔ کچن کی نگرانی کر لیجیے۔ باقی وقت اپنے نماز روزے میں گذارئیے۔ اب آپ کے لیے محنت کا نہیں آرام کا وقت ہے۔ قرآن شریف پڑھیے۔ میرے حق میں دوائے خیر کرتی رہا کیجیے۔ باقی یہ کہ لڑکیوں، میری بھانجیوں کے لیے، دوسری آیا موجود ہے۔ ابراھیم خانساماں کا نام ہے، بشن سنگھ گور کھا ہے، مادھو میرا ڈرائیور ہے۔ لیکن بلا کسی ضرورت کے جھگڑوں قضیوں میں نہ پڑیے۔''

''میں خود ـــ'' چھمی بیگم نے کہنا چاہا، لیکن رضیہ بانو نے ان کی بات کاٹی:

''میری اللہ کے فضل سے بہت بڑی بزنس ہے۔'' کچھ توقف کے بعد اضافہ کیا۔ '' ایکسپورٹ امپورٹ جانتی ہیں، ایکسپورٹ امپورٹ؟''

''جی ہاں!'' چھمی بیگم نے سر ہلایا۔ صبیح الدین صاحب محکمۂ تجارت کے افسر تھے اور اس طرح کے الفاظ چھمی بیگم کے کانوں میں پڑتے رہتے تھے۔ رضیہ بانو چھمی بیگم کو بہت سمجھ دار اور نیک دل بی بی معلوم ہوئیں اور اس قدر خدا پرست۔ چھمی بیگم نے ان کا باریک نائٹ گاؤن اور سگرٹ نوشی معاف کر دی۔

''میں عورت تن تنہا اتنا بڑا کاروبار چلا رہی ہوں۔ اس کی وجہ سے دس طرح کے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ بھانجیاں بھی آج کل کی لڑکیاں ہیں۔ ان کے دوست احباب بھی آتے رہتے ہیں۔ پھر میری بزنس کی وجہ سے دو مرتبہ پولیس ریڈ کر چکی ہے۔''

''پولیس؟'' چھمی بیگم نے ذرا دہل کر دھرایا۔

رضیہ بانو ھنس پڑیں۔'' ڈریے نہیں۔ یہاں بڑے بڑے تاجروں کو پولیس اور انکم ٹیکس والے پریشان کرتے ہیں۔ میں اکیلی عورت، دسیوں دشمن ہو گئے۔ کسی نے پولیس کو جا کر خبر دی کہ میں نے انکم ٹیکس نہیں دیا۔ بس دوڑ آ گئی۔ اسی وجہ سے میں نے باہر لوہے کا دروازہ لگوا لیا ہے۔ تو آپ سے کہنا یہ ہے کہ جب باہر کی گھنٹی بجے تو آپ پہلے سوراخ میں سے دیکھ کر اطمینان کر لیجیے۔ کبھی کبھی پولیس والے سادہ کپڑوں میں بھی آجاتے ہیں۔''

چھمی بیگم سفر کی تکان اور چائے کی طلب میں نڈھال ہوئی

جا رہی تھیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور بولیں : ” بی بی ، گیس کا چولہا کیسے جلتا ہے ؟ “

رضیہ بانو نے سرھانے ایک برقی بٹن دبا دیا ۔ ایک منٹ میں ابراھیم باورچی دروازے میں نمودار ہو گیا ۔

” ابراھیم ! یہ ھماری نئی بوا ھیں ، ان کے لیے چائے تو بنا دو جھٹ پٹ ! “

چھمی بیگم جلدی سے اٹھ کر ابراھیم کے پیچھے پیچھے کچن کی طرف روانہ ہو گئیں ۔

ظہر ، عصر ، مغرب ساری نمازیں پڑھ کر وہ پھر بالکنی میں جا کھڑی ہوئیں ۔ گھر میں کام کرنے کے لیے کچھ کام ھی نہ تھا ۔ رضیہ بانو بن سنور کر باھر جا چکی تھیں ۔ ” دو بھانجیوں “ کے کمروں میں روشنی جل رہی تھی ۔ تیسری ” بھانجی “ غائب تھی ۔ تینوں چاروں ملازم بھی فلیٹ میں نہ تھے ۔ اس لیے گھنٹی بجی تو بجتی ھی چلی گئی ۔ چھمی بیگم نئی دلی کی عادت کے مطابق فوراً دروازہ کھولنے کے لیے ڈرائینگ روم کی طرف لپکیں اور جلدی سے اندر والا دروازہ کھول دیا ۔ باھر کا آھنی دروازہ اس وقت پہلے سے ایک طرف کو سرکا ھوا تھا ۔

اور جس طرح صبیح الدین صاحب اور راشد صاحب کی کوٹھیوں میں ڈرائینگ روم کی دھلیز پر آ کر وہ مہمانوں سے بہت اخلاق سے کہتی تھیں ۔ ” تشریف لائیے ۔ “ اسی عادت کے مطابق انھوں نے اخلاق سے کہا ۔ ” تشریف لائیے ۔ “

دو فربہ مارواڑی اور ایک معطر نوجوان امیرزادہ اندر داخل ہوئے ۔ امیرزادہ سیدھا بار کی طرف چلا گیا ۔ فربہ مارواڑی دھم سے ایک صوفے پر بیٹھ گئے ۔ صبیح الدین صاحب کے ھاں بھی اکثر اس وضع قطع کے کاروباری اپنی غرض سے آیا کرتے تھے ۔ معطر نوجوان کو دیکھ کر البتہ ذرا تعجب ھوا ۔ پھر سوچا اس شہر کا یہی دستور ہو گا ۔ ابھی وہ یہی طے کر رہی تھیں کہ معزز مہمانوں سے چائے کے لیے پوچھیں یا کافی کے لیے کہ سونے کے بٹنوں اور ھیرے کی انگوٹھیوں والے فربہ تر مارواڑی نے ڈپٹ کر پوچھا ۔ ” میڈم کدھر ہے ؟ “

چھمی بیگم بخوبی جانتی تھیں کہ بیگم کو میڈم کہتے ھیں ۔

سلیقے سے جواب دیا - ''میڈم باہر گئی ہیں -''

''سالا چھوکری لوگ کدھر گیا ؟''

چھمی بیگم کو غصہ آگیا - یہ صحیح ہے کہ اہل بمبئی تمیز دار اور اہل زبان نہیں لیکن یہ گالی گلوچ کیا معنی ؟ انہوں نے ہونٹ بچکا کر پوچھا - ''بیگم صاحب کی بھانجیاں ؟''

اتنے میں دروازہ کھلا اور رضیہ بانو سرعت سے خود اندر آ گئیں - چھمی بیگم سے کہا -''بوا تم جا کر اپنی کوٹھڑی میں بیٹھو - آرام کرو -''

''جی اچھا -'' انہوں نے جواب دیا - ان کے گیلری میں سے گزر جانے کے بعد ایک '' بھانجی '' کے کمرے سے ایک صاحب نکل کر باہر چلے گئے -

چھمی بیگم نے اپنی کوٹھڑی میں جا کر بستر ا کھولا - جا،نماز نکالی ، وضو کیا ، نفلیں پڑھنے لگیں اور اس رب ذوالجلال کا شکر ادا کیا جسے اپنے بندوں پر صرف دو وخت ھنسی آتی ہے اور اسی پاک پروردگار نے ان کے باپ دادا کی لاج ، ان کے حسب نسب کی عزت رکھ لی اور ایک بار پھر ایک شریف گھرانے کے حق حلال کی کمائی میں ان کا حصہ بھی لگا دیا !

سائے اور همسائے

غیاث احمد گدی

منور خموشی کے بلور چھنکے
کرن مرمریں فرش پر چھن سے ٹوٹی
کلی چٹکی ، آواز کے پھول مہکے
رنگوں کی سروں کی کوئی کہکشاں
کھل کھلاتی ہوئی گود میں آ پڑی ہے
خموشی کے گہرے سمندر کی تہہ سے
کسی جل پری نے مجھے جیسے آواز دی ہو
اندھیرے کے پردے ہلے ، ساز چونکے
کئی نور کی انگلیاں جگمگائیں
شفق در شفق ، رنگ در رنگ
عارض کا حیرت کدہ سامنے ہے
وہ ہنستا ہؤا میکدہ سامنے ہے
دھنک سامنے ہے
کسی کو یہ قصہ سناؤں ...!

(" بلور" : مخدوم محی الدین)

وہ دونوں جو نوے دن پہلے گھر سے بھاگے تھے ، اور گھبراتے ہوئے دل کے سکون کے لیے " شانتی نواس " ہوٹل میں سکونت اختیار کی تھی —

وہ دونوں بے زار بے زار سے تھے ...!

کلا نے پلٹ کر پھیلے ہوئے بےرونق میدان کی طرف دیکھا ، تو سارے میں پیروں سے کچلی اور دھوپ میں جلی ہوئی گھاس بے حال پڑی تھی ۔ ایک بدرنگ سا خارش زدہ کتا کچھ سونگھتا پھر رہا تھا ، اور دو بیمار سے گدھے گردن نہورے کھڑے تھے ۔

اداسی ، بے طرح اکتا دینے والی اداسی اس پر محیط ہو گئی ۔ کلا نے پلٹ کر اس آدمی کی طرف دیکھا ، جو سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے لگا باہر کی طرف تک رہا تھا اور خود بے چین سا تھا ۔

" ہم نے اچھا نہیں کیا ! "

یہ کس کی آواز تھی ...! کلا نے محسوس کیا ، یہ آواز اس کی اپنی ہوتے ہوئے بھی اجنبی اجنبی سی ہے ۔ جیسے خود سدھیر اس کا اپنا ہوتے ہوئے بھی اجنبی اجنبی سا لگنے لگا ہے ۔! لیکن کلا کی آواز سن کر سدھیر چونک پڑا ۔ اسے لگا جیسے یہ آواز اس کی دیکھی بھالی ، جانی پہچانی ہو ...!

سدھیر نے کلا کو غور سے دیکھا ، نوے دنوں نے کلا کو کئی جگہ سے ، ہلکے ہلکے ہی سہی ، مگر کھرچ ڈالا تھا ۔ اور وہ کلا جو نوے دن پہلے تک اسے اپسرا نظر آ رہی تھی ، اب کچھ پھیکی پھیکی ، سیٹھی سیٹھی ... بوڑھی ...!

لیکن نہیں ، وہ بوڑھی تو نہیں دکھائی دے رہی تھی ۔ یہ محض اس کا خیال ہے کہ آدمی اتنی جلد بوڑھا ہو جاتا ہے ! صرف نوے دنوں میں بہاریں اپنے خیمے اجاڑ ڈالتی ہیں !! یہ اجنبی اور کھسوٹ لینے والا خیال ، شاید اس کے دل میں بہت دنوں سے پل رہا تھا ، اتنے دنوں سے جتنے دنوں کی اس کی محبت تھی ۔ یا شاید اس سے کچھ آگے ...

مگر کلا آج کچھ پھیکی پھیکی ، سیٹھی سیٹھی تھی ، بہر حال تھی ۔ سدھیر کی آنکھیں کوئی عیب جو کٹنی تو نہیں تھیں ، ایک

معصوم صفت بچہ تھیں جو سچائی سے جو کچھ دیکھتا ہے بیان کر دیتا ہے ۔ جس جلوے کو اُس نے اپنی تمام زندگی کا حاصل سمجھا تھا ، وہ یہی کلا تھی نا ...؟

بہرحال کلا تھی ۔ کوئی فرق نہیں تھا ۔ ابھی ابھی وہ سو کر اُٹھی تھی ، رات بھر کی کچلی ہوئی ۔ اس کے لہو کے سارے چراغ ساری رات جلتے رہے تھے ۔ سدھیر کے بستر کی دنیا میں چراغاں کیے ہوئے تھے... جو صبح ہونے سے کچھ پہلے آہستہ آہستہ بجھنے لگے ۔ پھر ایک دم سے بجھ گئے ۔!

"مجھے اچھا نہیں لگتا !" کلا نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا ۔

"کیا اچھا نہیں لگتا ؟" سدھیر نے اتنے ہی بجھے ہوئے لہجے میں پوچھا ۔ "میں ؟"

"نہیں نہیں ، میرا مطلب ہے یہ سب کچھ ... یہ چونچلے..." پھر کلا نے اپنے لمبے سیاہ گھنے اور اجنبی راہبروں کو بھٹکا دینے والے بالوں کو جھٹکا اور گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بہت کچھ کہنے اور کچھ نہ کہہ سکنے کے بیچوں بیچ پہنچ کر آہستہ سے بولی "لگتا ہے کسی چیز کی کمی پڑ رہی ہے ، جیسے کچھ گھٹ رہا ہے ، گویا کچھ اچھا لگتے ہوئے بھی اچھا نہیں لگ رہا ...!"

"جیسے ہر شئے میں ، کسی شئے ..."

"نہیں!" کلا نے سدھیر کے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ دیں ۔ "نہیں ، مجھے شعر بھی اچھے نہیں لگتے !"

سدھیر نے جواب دیا ۔ صرف پلٹ کر گہری نظروں سے دیکھا ۔ وہ ایک لمحہ میں کلا اسے کیا نظر آئی ؟ ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود وہ فیصلہ نہ کر سکا ۔ نوے دنوں میں نہ صرف وہ خود بلکہ کلا بھی کئی جگہ سے ہل گئی تھی ۔ محبت کی وہ عمارت جس کی تعمیر میں ان دونوں کا لہو جلا تھا ، اس کی اینٹ کھسک رہی تھی — نوے دنوں میں اتنی ہی اینٹیں ہل گئی تھیں ۔

"صرف دس اینٹیں رہ گئی ہیں !" خبر نہیں سدھیر نے کہاں پہنچ کر یہ جملہ ادا کیا کہ خود اُسے ٹھنڈا پسینہ آ گیا ۔ سوچا کہ بھاگ نکلے مگر کلا سامنے کھڑی تھی ۔

"کیسی اینٹیں ...! کیسی دس اینٹیں ؟"

"محبت کرنے والے بے قرار دلوں نے ایک عمارت بنائی تھی —

سدھیر خاموشی سے شیو کرتا رہا ۔ اور اس کا لاشعور جو بڑا سچا تھا ، کھرا تھا ، بے باکی سے بولتا رہا ۔ ' نوے دنوں میں یہ خوبصورت عمارت تیار ہو گئی ، تو ایک دن ان دونوں نے اس میں پرویش کیا تھا ۔ دھڑکتے ہوئے ، خوف زدہ اور محبت سے سر شار دلوں نے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کیں ۔ جانے کس نے کیا کہا ، جانے کس نے کیا سنا کہ اس کے بعد چاروں اور کنواری دھرتی پر، برسات کی پہلی بوندیں پڑنے سے جیسی سوندھی سوندھی ، کنواری کنواری خوشبوئیں پھیل جاتی ہیں ، ویسے ہی کچھ خوشبو سے چاروں دشاؤں کے نتھنے مہک اٹھے ...!''

''اُنہہ !'' کلا اُکتا گئی ۔ اُس نے اپنے لمبے سیاہ بالوں کو گردن کی ہلکی جنبش سے پرے کرتے ہوئے آہستہ سے کہا ۔

''تم بہت بولتے ہو ، سدھیر ، مختصر کرونا !''

سدھیر کا ہاتھ رک گیا ۔ اُس نے شیشے ہی میں سے اُسے دیکھا ، جو گہری ، گنبھیر اور ایک ذرا اداس بیٹھی تھی ۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی ۔ '' اینٹیں سنبھالے نہیں سنبھل رہی ہیں ، کلا !''

''کیا ؟''

''پہلے تم کہتی تھیں ، تم بہت اچھا بولتے ہو ، سدھیر ؟''

پہلے پہلے ... پہلے ... ہر لمحہ جو بیت جاتا ہے وہ بہت پیارا ہوتا ہے ۔ ہر جذبہ جو مر جاتا ہے دلوں میں اُس کا مزا رہتا ہے ! ایسا کیوں ہوتا ہے ... ایسا کیوں ہوتا ہے ... زندگی اتنی بے وفا ، اتنی بے ایمان ، ایسی بے مروت کیوں ہے ۔ اس کو جتنی شدت سے پکڑو ، پھسل جاتی ہے ۔ ریت بھری مٹھی کی طرح پل کی پل میں خالی ہو جاتی ہے ۔ ایسی جاتی ہے کہ پلٹ کر نہیں دیکھتی ۔ کہ کوئی نامراد اس کا دامن پکڑ کر ، پوچھ لے کہ تم نے مجھے کیا دیا ؟ یا جو کچھ دیا وہ سب اتنی جلدی چھینے کیوں لے رہی ہو ...؟

''کیا سوچنے لگیں ؟''

''کچھ نہیں !'' کلا چونک کر بولی ۔ پھر اپنے آپ سے سہم گئی ۔ '' تم کیا کہہ رہے تھے ، وہ نوے اینٹوں والی بات ؟''

'' میں کہہ رہا تھا کلا کہ محبت کے اس محل میں رہتے ہوئے ہمیں نوے دن بیت گئے ہیں ...، ذرا دیر کو وہ ٹھہر گیا ۔ اور کلا کے چہرے پر ردعمل پڑھنے کی کوشش کی ۔ پھر مسکرا پڑا ۔'' اور

اب صرف دس اینٹیں رہ گئی ہیں !" سدھیر بادل ناخواستہ چپ ہو گیا ۔

کلا کے اندر کی دنیا میں کسی نے جھانک کر سرگوشی کی ۔ بڑی آہستگی سے کسی چالاک کٹنی کی طرح کوئی پھسپھسایا ۔ " اور اگر دس اینٹیں بھی ہل گئیں تو ؟ " جانے کہاں سے ایک طوفان سا اٹھا اور اس کے باہر کی دنیا پر بھی چھا گیا ۔ کلا کانپ سی گئی ۔ اس کے چہرے پر گہرے غم کا سایہ یوں منڈلایا کہ ضبط کے بندھن ٹوٹتے محسوس ہوئے ۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی ۔ اور پھر اس کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی جہاں سے سمندر ، بے کراں سمندر ، اس کی زندگی کا پرتیک ، تنہا سمندر پھیلا ہوا تھا ۔ گہرا ، نیلا ، زہر گھلا ہوا ، کروٹیں لیتا ہوا سمندر ، اس کے متلون مزاج زندگی کی طرح پہلو بدلتا ہوا سمندر ... کلا کی آنکھیں چھلک اٹھیں ۔ ایک جھکڑ سا چلنے لگا ...

آرے سمندر آ ... آ تو مجھ میں سما جا کہ آنے والے لمحے میری تاک میں بیٹھے ہیں ! لمحے ، جو ابھی سے چین نہیں لینے دیتے ۔ میرے اس سامدرک جیون میں تم ہی تم ہو ۔ یا پھر ... یا پھر ...!

سدھیر نے اس کے کندھوں پر یوں ہاتھ رکھا کہ اسے تنکے کا سہارا مل گیا ۔

" تم خواہ مخواہ سہمی جاتی ہو ، کلا ! میں نوے اینٹوں کو پھر سے مضبوط کر لوں گا ۔ میری محبت ... ہماری محبت میں اتنا دم ہے ! "

کلا جھپٹ کے اس کے سینے سے لگ گئی ۔ اور تقریباً روتی ہوئی آواز میں کہا ۔ " جانے کیوں ایسا لگتا ہے ، سدھیر ، ایسا لگتا... اس کی آواز گلے کی رہ گذر میں بھٹک گئی اور وہ سدھیر کے سینے سے لگی ، سسک سسک کر رونے لگی ...

پھر بہت دیر ہو گئی ۔ سامنے سانجھ کے پیار سائے جھک آئے ۔ تھکے ہارے دن کے رگ و پے میں تھکان ہی تھکان سرایت کرنے لگی ۔ پتہ نہیں کہاں سے ایک پرندہ سمندر کی سطح پر منہ مار کر اونچائیوں کی طرف اٹھ گیا ۔ کلا سر سے پاؤں تک لرز اٹھی ۔

عین اسی لمحہ سدھیر نے اس کی ٹھوڑی اونچی کر کے ہونٹوں کو چوم لیا ۔

" چلو کہیں گھوم آئیں ۔ پھر آگے سوچیں گے ! "

آگے سوچنے کے لیے جتنے راستے ہو سکتے ہیں ، سب کھلے پڑے ہیں - وہ کسی راہ پر بھی مڑ سکتی ہے - کوئی روکنے والا نہیں - کوئی پوچھنے والا نہیں - زندگی اتنی سبک سر ہوتے ہوئے بھی ایسی چٹان کی طرح بھاری کیوں ہو جاتی ہے کبھی کبھی ؟

چٹان کی طرح بھاری کیوں ہو جاتی ہے ؟

مگر کبھی کبھی ...! یہ کبھی کبھی کی بد رونقی ، یہ کبھی کبھی کی افسردگی ، یہ کبھی کبھی کا بے پناہ سناٹا ، مگر اس کی کبھی کبھی کی بہاریں بھی تو ہیں جو اس کی زندگی کے ویرانے میں پھول ہی پھول کھلاتی ہیں - ایک نغمگی کا جادو جو اس کی ہستی کے گرد چھا جاتا ہے ؟ کلا نے اس کا جواب نہیں دیا - کلا نے حسب معمول اپنے آن ہونٹوں کو نہیں پونچھا جن پر ابھی ابھی سدھیر کے لبوں نے سجدے کیے تھے - وہ خاموشی سے سمندر کی اور دیکھتی رہی - جس پر حد نگاہ سلوٹیں ہی سلوٹیں پھیلی ہوئی تھیں - ابھی ابھی جس کی بے تاب سطح پر ایک پیاسا پرندہ منہ مار کر اڑ گیا تھا - لذت کا ایک لمحہ چرا کر بھاگ گیا تھا -

اس نے پلٹ کر سدھیر کی طرف دیکھا - " کیا یہ سچ ہے کہ میں پھیکی پھیکی ، سیٹھی سیٹھی ، بوڑھی ... ؟ "

" نہیں نہیں ! کلا خدا کی قسم بوڑھی نہیں ! " سدھیر نے ندامت سے مگر سچائی سے جواب دیا — مگر سیٹھی سیٹھی ... "

" وہ اس لیے کہ " کلا نے جلدی سے بات کاٹ کر جواب دیا " میں نے منہ نہیں دھویا ابھی دھوؤں گی تو پھر.... " کلا دفعتاً دنگ رہ گئی - وہ کیا کہہ رہی ہے - خود حفاظتی کا یہ انوکھا ، بے ایمان جذبہ کہاں سے اس کے دل میں پیدا ہو گیا - وہ کیوں مدافعت کی ضرورت محسوس کرنے لگی ہے - کیا سدھیر نے اس شگفتہ چہرے سے ہی محبت کی ہے ، جو کبھی کبھی اس کے پاس ہوتا ہے تو کبھی کبھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے - کیا ایسے لمحے میں سدھیر اس کا نہیں ہوتا ؟

کبھی کبھی سدھیر بھی تو بڑا نڈھال تھکا ہارا دکھتا ہے ! کلا نے اپنے بے قرار ذہن پر زور دے کر سوچا ، کیا ایسے لمحے میں بھی وہ اسے اتنا ہی پیارا ، اتنا ہی قتل کر دینے والا محسوس ہوتا ہے ؟ شاید نہیں !

شاید ہاں !

زندگی کے مثبت اور منفی انداز بہر حال باقی رہ ہی جاتے ہوں گے۔ شاید یہی زندگی کی اٹوٹ سچائی ہے۔ شاید یکسانیت سے ، تواتر سے نجات حاصل کرنے کا قدرت کی طرف سے یہ صحیح راستہ ہے۔

" مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں نے کوئی تمھارے چہرے سے تھوڑے محبت کی ہے ! " یہ سدھیر تھا جس نے اسے گلے سے لگاتے وقت یہ الفاظ ادا کیے تھے۔ کلا کے ذہن کے اسپ تازی کو پھر ایک چابک سی لگی۔ اس کا حقیقت پسند دماغ دراصل محبت کرنے کے قابل ہی نہیں۔ کلا نے پھر سوچا ، شاید محبت کا مفہوم یہی رہا ہو کہ اس کی آراستگی جھوٹ کی قندیلوں سے ہو۔ جھوٹ کی رنگا رنگ جھنڈیاں یہاں سے وہاں تک لرزتی رہیں ، لرزتی رہیں !

" کلا ، کیا سوچ رہی ہو ؟ "

" کچھ نہیں ! " کلا نے قتل کر دینے والے انداز سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا — " میں بھی کوئی تمھاری عمر ، تمھارے اس ناتوان جسم ... سے ! " اور جملہ نامکمل چھوڑ کر سدھیر کے جسم سے لپٹ گئی — شاید سچ محبت کے لیے زہر ہے ؟ "

پھر وہ جلد ہی الگ ہو گئی۔ " میں ابھی منہ ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔ پھر ہم گھومنے چلیں گے ! "

آج کی شام بڑی پیاری تھی۔ آج کی شام اتنی پیاری ہوتے ہوئے بھی اداس بھی تھی۔ جیسے شام نہ ہو ، کلا ہو۔ اتنی دل آویز ہوتے بھی جس کے چہرے پر غم کا ، اندرونی غم کا سایہ منڈلا رہا ہو۔ آج کی شام ، سالِ نو کی پہلی شام اپنے دامن میں چراغوں کی بارات لیے گزر رہی تھی۔ چراغوں کی قطار ، آڑی ترچھی ، سیدھی ، صراط مستقیم کی طرح پھیلے ہوئے چراغ مگر جن سے اردگرد ہلکا ہلکا دھواں بھی دکھ رہا ہے۔ کوئی چلتے چلتے یوں ہی دیکھتا ہے تو صرف روشنی ہی روشنی دکھتی ہے۔ کوئی پل بھر کو ٹھہر کر غور کرے تو ...

چلتے چلتے اس نے ایک جگہ ٹھہر کر کلا کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے سے تھام لیا۔ " اس روشن تابناک چراغ کے آس پاس دھواں سا کیوں اٹھ رہا ہے ! ایسی بھی کیا بات ہو گئی کلا ؟ "

" مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے ، کچھ خوف سا ، کچھ

بے چارگی سی ، کچھ گویا میں نے اچھا نہیں کیا ۔ کبھی کبھی میری بنیاد ہل جاتی ہے ۔ سدھیر ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ شاید وہ اینٹ جو میں نے رکھی تھی ، وہ اینٹ جو تم نے رکھی تھی ، وہ مضبوط نہیں پڑی تھی !''

''نہیں کلا !'' سدھیر نے اطمینان سے ٹھہر کر کسی بڑے گہرے آدمی کی طرح جواب دیا: ''یہ تمہارا وہم ہے ۔ دراصل یہی وہم ہے جو محبت کو اتنا خوبصورت ، اتنا ملیح بنائے رکھتا ہے کہ دل کو مسلسل اضطرار نصیب ہوتا ہے ۔ مجھے بھی کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کلا کہ اینٹیں ہل رہی ہیں ۔ لیکن صرف کبھی کبھی ۔ اور تم ، کلا ! لگتا ہے تم کبھی کبھی ہی اس وہم سے نجات پاتی ہو ۔ اس لیے تم مجھ سے زیادہ محبت کرتی ہو ۔ اور شاید میں تمہیں اس شدت سے نہیں چاہتا ۔''

کلا نے چلتے چلتے رک کر اس کے چہرے کی طرف خاموشی سے دیکھا ۔ اور جانے کیا پڑھ کر آگے بڑھ گئی ۔ اور چپ سادھے چلتی رہی ۔ بہت دیر ہوگئی ۔ سارے میں شور و غل ، ہنسی قہقہے ، نغمے ہی نغمے بکھرے پڑے تھے ۔ اس کے کندھے پر سدھیر کا ہاتھ تھا ۔ کبھی کبھی چلنے میں اس کا پاؤں سدھیر کی ٹانگوں سے مس ہو جاتا تھا ۔ شاید محبت اتنی قریب ہو جاتی ہے تو اپنا حسن کھو بیٹھتی ہے ! شاید ... پھر کلا اپنے ذہن کے آزاد پرندے سے چونک اٹھی ۔ ذرا نہیں ٹھہرتا ، جدھر جی چاہتا ہے اڑ بھاگتا ہے ۔ اس نے ایسا کیوں سوچا ، چلتے چلتے کلا نے سوچا ، یہ سوچ کا پنچھی اتنا بے قرار کیوں ہے ۔ کسی شاخ پر اس کے پاؤں جمتے کیوں نہیں ! جب سدھیر پاس نہیں ہوتا تھا تو اس کے لیے وہ بے تاب تھی ۔ اب وہ مل گیا ہے ، اس سے اتنا قریب آگیا ہے ، یہ شاخ جھکتی محسوس ہوتی ہے ۔ ایسا کیوں؟ شاید یہ سچ ہی ہو کہ محبت قربت کے خنجر سے زخمی ہو جاتی ہے ۔ پھر کلا نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا جیسے کوئی گہرے کنویں میں جھانک کر دیکھے ، مگر وہاں تو سدھیر ہی سدھیر ہے ... سدھیر ہی سدھیر ...!

شاید قربت ظاہری حسن کو آنکھوں سے اوجھل کر دیتی ہے اور محبت کو دلوں کی گہرائیوں میں آتار دیتی ہے جیسے شبنم کا کوئی قطرہ سوکھی دھرتی پر گرتا ہے ، ذرا ٹھہرتا ہے ، ذرا کی ذرا اپنی چمک دکھاتا ہے ، پھر دھرتی کے سینے میں ڈوبنے لگتا ہے ، ڈوبتا

ہی جاتا ہے ۔

" دیکھو ، کلا ، یہ گیٹ وے آف انڈیا ہے ۔ ہم لوگ اتنی بار اس کے قریب سے گزرے ، دیکھا بھالا ، مگر اس کی طرف ٹھہر کر دیکھا نہیں ۔ یہ وہ دروازہ ہے جس کی راہ سے غیر ملکیوں نے ہندوستان کی سرزمین پر اپنے قدم رکھے !" سدھیر نے صرف کلا کی توجہ ہٹانے کی غرض سے کہا ۔

ہوا خوش گوار تھی ، سارے میں سالِ نو کی آمنگ ہی آمنگ تھی ۔ اب کلا کے ذہن کو کہیں سے مٹھی بھر سکون میسر آگیا تھا ۔

" ہاں ، میں جانتی ہوں ۔ ایسے ہی ایک دروازے سے ایک اجنبی قدم نے میرے ہندوستان میں پہلی اینٹ رکھی تھی !"

" مجھے نہیں پتا تھا ، کلا ، میں تو ایک سیاح تھا ۔ میں کیا جانتا تھا کہ تمھاری دھرتی میں اتنی کشش ہے کہ مسافر لوٹ کر جا ہی نہیں سکتا !"

کلا نے جواب نہیں دیا ۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نے نو روز کے چراغ روشن کرنا شروع کر دیے تھے ۔ وہ سامنے سمندر کے تاریک سینے پر دور سے آتے ہوئے ایک جہاز کی جانب دیکھے جارہی تھی ۔ میں اپنی دہلیز سے لگی کھڑی تھی ۔ سامنے سے کتنے جہاز آتے تھے اور گزر جاتے تھے ۔ مجھے کسی نے کبھی نہیں کھینچا ، کسی نے کوئی آواز نہیں دی !

پھر بہت دن گزر گئے ۔ جانے میری ، اندر کی دنیا کو کوئی انتظار ضرور تھا ، میں لاپروا تھی ، باہر ہی باہر گھومتی پھرتی تھی ۔ مگر اندر کسی کی بات جو تک رہا تھا ۔ جب ہی میں نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو اندھیرے میں ایک سفید سفید مستول نظر آیا ۔

پھر میرے کانوں نے دور سے آتی ہوئی ایک آواز ، سائرن کی آواز سنی ۔ جو مجھے کہیں کہیں سے ہی سہی ، مگر مجھے برما گئی ۔ پھر جہاز کنارے لگا اور کوئی اجنبی اترا اور اس نے بڑی آہستگی سے اپنے قدموں کی پہلی اینٹ رکھی ، دھپ سی !

میری ساری دھرتی لرز اٹھی ۔ میرے ہندوستان کے سارے باطن میں ایک گونج سی سنائی دی ۔ میری شاخ پر بیٹھے ہوئے کتنے ہی پرندوں نے پر تول لیے ۔ یہ تم تھے !

" اور یہ تم تھیں !" قریب کے بینچ پر وہ دونوں بیٹھ گئے ۔ سامنے سے ایک رنگوں کا ریلا ، کچھ جوانیاں گزر گئیں ۔ لہرا کر

بالوں کی ایک لٹ اُس کے رخسار پر پھیل آئی جسے سدھیر کی انگلیوں نے اپنے بے تاب لبوں سے چوم لیا ۔

'' اور یہ تم تھیں ! میں اپنا ویرانہ لیے جہاں تہاں مارا پھرتا تھا ۔ ٹھیک میرے گھر سے نکلنے پر دوسرے مکان کے دریچے سے لگی تم ایک گلاب کھلاتی رہتیں اور میری جانب کلیاں بکھیرے دیتیں ... ''

ذرا ٹھہر کر سدھیر نے کلا کی طرف دیکھا ۔ اور اس کے گلاب کو چوم لیا ۔ '' پھر کیا ہؤا جانتی ہو ؟ پھر ان کلیوں میں لپیٹ کر تم نے ایک روز ایک موتی رکھ دیا تھا جو سیدھے میرے تلوں میں چبھا اور میری آنکھوں میں خون بن کر آترگیا ۔''

'' خون بن کر !'' کلا نے پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر آہستہ سے احتجاج کیا '' نہیں ، میں نے کسی کے لیے کوئی کانٹا نہیں رکھا تھا !''

'' تم میں اور مجھ میں یہی فرق ہے ، کلا ۔ عورت کبھی اپنے سر کوئی الزام نہیں لینا چاہتی ۔ خواہ ، الزام کتنا ہی پیارا کیوں نہ ہو ! ''

'' نہیں نہیں ، میں نے کوئی جرم کیا ہی نہیں ۔ یہ محض تمہاری غلط فہمی تھی ۔''

'' اسی غلط فہمی کی سیڑھیوں پر قدم رکھتا ، میں ایک دن تمہارے ایوان میں پہنچ گیا اور تم کھڑی دیکھتی رہیں ۔ اور زبان سے نہ سہی آنکھوں سے خوش آمدید کہا ۔''

کلا چپ رہی تو سدھیر نے ہنستے ہوئے کہا ۔ '' یوں پکڑے جاتے ہیں مجرم ! ''

کلا نے چونک کر کہا ـــ '' جھوٹے ! '' اور آہستہ سے مجرموں کی طرح گردن جھکا لی ۔

'' پھر ، کلا ، جانتی ہوکیا ہؤا ؟ برسوں سے میرے ویرانے میں ایک خشک لکڑی پڑی تھی ، برق رسیدہ ، لیکن آندھیوں اور جھکڑوں کے صدمے برداشت کیے ہوئے ۔ میں نہیں جانتا تھا ، یہ سوکھی لکڑی کیوں ہے ، کب سے ہے ـــ میں نے جب بھی دیکھا وہ ہری نہیں تھی ۔ میں ڈرتا تھا ، کہیں کسی آندھی کی زد میں آکر یہ ٹوٹ ہی نہ جائے ۔ پھر سوچتا ، یہ ٹوٹ ہی جائے تو بہتر ۔ کیا فائدہ ، اس میں اب ہریالی کہاں سے آئے گی ! اس کی رگوں کا سارا

لہو ناکامیوں کی جونک نے چوس لیا ہے ۔ اس کی ہریالی کے سارے چراغ سمئے کی صرصر نے بجھا دیے تھے ۔ اب تو دھواں بھی نہیں اٹھتا ۔ یہ ٹوٹ کر بکھر ہی جاتی تو اچھا ہے ۔ ٹوٹ ہی جائے !

” مگر جانے کس کونے سے کوئی نفی میں سر دھنتا رہتا ، میں کہتا رہتا ، کوئی انکار میں گردن ہلاتا رہتا ۔ یہ کون تھا ؟ میں نہیں جانتا ۔ یہ کہاں چھپا بیٹھا رہتا ، مجھے معلوم نہیں ۔ اتنے میں ایک نیا دن میری زندگی میں آیا ، جب میں تمھارے قریب تھا ۔ اپنے ویرانے کو چھپائے ھنستا رہا ۔ باتیں کرتا رہا ، باتیں سنتا رہا ۔

” ان باتوں باتوں میں تمھاری آواز کی لہک ، تمھارے لہجے کی شمع میری اس شاخ سے چھو گئی !“

کلا اتنی محویت سے سن رہی تھی ، مگر بچوں کی طرح ھنس پڑی ۔ ” ھنہ ! تمھیں شاعری بھی کرنی نہیں آتی ! “

” ھاں ، کلا ، شاعری کی زبان بھی اس جذبے کے اظہار سے قاصر ہے ۔ الفاظ کو ابھی وہ انگلیاں نصیب نہیں ھوئی ھیں جو اس جذبے کو گرفت میں لے سکیں ! “

” اچھا ، پھر کیا ھؤا ؟“ اس نے گردن آڑی کر چہرے کو گھٹنے پر رکھ لیا اور سدھیر کی طرف لگاوٹ سے دیکھنے لگی ۔

” تمھاری شاخ جل اٹھی ؟ “

” نہیں سلگ اٹھی !“

” سلگ اٹھی ، جلی نہیں ۔ کیا مطلب ؟ “

” سلگ اٹھی ، ہولے ہولے جسے میرے تنفس نے اور سلگا دیا ۔ ذرا ذرا دھواں پھیلا ... میرے ویرانے میں یہ خوشبو کیسی؟ میری شام نے پلٹ کر دیکھا اور سرشار ہو گئی ۔ ارے یہ تو چندن کی مہک ہے ! “

” آرزو کی شام جب سلگتی ہے تو اس میں سے چندن کی بُو پھیلتی ہے جو دلوں کے معبد میں سوئے خداؤں کو بیدار کرتی ہے ۔ عبادتوں کو عرفان عطا کرتی ہے ، کلا !

” یہ دوسری اینٹ تھی ، جو تمھارے نازک خوبصورت ، مگر لرزیدہ ھاتھوں نے رکھی ! “

کلا کے چہرے کی مملکت پر ، مغرب سے مشرق تک مسکراہٹ کی صبح جھلملا اٹھی ۔ اس نے آھستہ سے ، لجا کر گردن جھکا لی ۔ گویا اپنے اس جرم کے انکار میں کوئی اور جرم کرنا نہیں چاھتی ۔

پھر صدیاں گزر گئیں ۔ کلا گردن جھکائے رہی ۔ اس کی نگاہوں نے فرش میں ڈوب کر پاتال میں گم ہو جانا چاہا — اور سدھیر دھیرے دھیرے ہنستا اور سگریٹ پیتا رہا ۔

" پھر وہ دن آیا جب میں چائے پی رہی تھی " کلا نے بھی محویت سے کہنا شروع کیا " کہ کہیں سے تم آ گئے ۔ تم نے چائے مانگی ۔ میں نے بنا کر دی ۔ تم کپ اُٹھا کر لبوں تک لائے ۔ پھر تم نے کپ رکھ دی ۔ اور میری جھوٹی پیالی کو اُٹھا لیا ۔ مگر اس میں چائے کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا ۔ تم نے مایوسی سے پیالی میز پر رکھ دی ۔

" افسوس ! " میرے لبوں نے ایک لفظ ادا کیا ۔ مگر سدھیر تم نے پلٹ کر یوں دیکھا جیسے میں نے تمہیں ایک دولت بے بہا سے محروم کر دیا ہو ۔ تم نے ایک بھونڈا سا لفظ ادا کیا ۔ " بھکڑ " جو بہت پیارا لگا ۔ پھر ہم دونوں ایک کیفیت میں ہنسنے لگے !

" یہ تیسری اینٹ تھی " سدھیر نے قطع کلام کرتے ہوئے جلدی سے کہا " جسے ہم دونوں کے ہاتھوں نے ایک ساتھ رکھا "

" نہیں نہیں ، میں نہیں ۔"

" نہیں نہیں ، میں بھی نہیں ! بلکہ ہم دونوں " کلا کی ٹھوڑی اوپر کرتے ہوئے اس نے اتنے اعتماد سے کہا کہ کلا کا سر پھر آپ سے آپ اقبال جرم میں جھک گیا ۔

لیکن کلا نے پھر گردن اُٹھائی ۔ " مگر میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا ۔ میں تو کبھی کچھ نہیں کرتی ۔ میرا ہندوستان تو بڑا خاموش ، پُرامن اور اپنے حال میں مست رہنے والا ، میری دھرتی کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی ۔ تم ہی قزاق ، لٹیرے ، ڈاکو ، فاتح ! "

" میں تمہارے ہندوستان میں کوئی قزاق لٹیرا ، فاتح ، کوئی ڈاکو بن کر تو نہیں آیا ، کلا ! میں فقیر ، ایک چشتی ، ایک پیار کا نغمہ گانے والا سنت ، میرے کندھے پر ملک ملک کی گرد و غبار میں اٹی کمبل تھی ، ہاتھ میں کشکول تھا اور لبوں پر محبت کا نغمہ تھا !

" چپکے سے تم نے پتا نہیں کہاں سے آ کر دم کے دم میں میرے کشکول میں ایک سکہ گرا دیا ۔ چھن ن ن ن نہ کی ایک نقرئی آواز آئی ، جیسے پورا چاند سمندر کے کشکول میں گر پڑے اور آہستہ

آہستہ اس کی سطح میں غرق ہو جائے۔ نور ہی نور ... ٹھنڈی میٹھی ، کنوارے بدن کی سی میٹھی کیفیت والی چاندنی ، میرے اندر کی تاریک دنیا میں کھلنے لگی !

" یکلخت میرے بھکاری نے اپنے آپ کو بے حد تونگر محسوس کیا ! "

" پھر میری مملکت کے پورب پچھم میں ، اُتر دکھن میں ایک حسین ، پاکیزہ اور پروقار صبح جگمگائی ۔ میری دھرتی کا ذرہ ذرہ چمکا ، میرے ہندوستان کے کونے کونے نے ایک کسلمند مگر میٹھی انگڑائی لی ! " کلا بھی محویت کے عالم میں ، ایک نشے کی کیفیت میں جھومتی ، ماضی کے سبزہ زار کی طرف اُڑ رہی تھی ۔ اُس نے اپنے آنچل کو گردن کے گرد پھینکا ۔ اپنے نازک خوبصورت پتلے پتلے ہونٹوں کے مرمر پر زبان کا خنجر پھیرا ، پھر دھیرے سے مسکرائی ۔

" اُس دن تم بہت اُداس اُداس ، کھوئے کھوئے سے تھے ۔ میں نے نگاہیں اُٹھا کر پوچھا ، تم نے افسردگی سے جواب دیا ۔ "

" کیا کروں کلا ! بڑی بیزاری ، بڑی گھٹن محسوس ہوتی ہے ! "

" یہاں بھی ؟ " میں نے ذرا تعجب سے پوچھا ۔ (یعنی میرے پاس بھی) ۔

" یہاں نہیں " تم نے پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا ۔ " مگر کلا میں یہاں روز روز تو آ نہیں سکتا (یعنی تمہارے پاس ہر وقت ہر سمئے تو نہیں رہ سکتا ! ")

" ہاں ! اور جس کے جواب میں تم خاموش ہو گئیں ۔ تم نے میرا مفہوم سمجھ لیا تھا ۔ میں تم سے ایک لحہ بھی الگ نہیں رہ سکتا اور تم خود میرے بغیر بے چین رہنے لگی تھیں ۔ "

" نہیں نہیں ، ایسا نہیں ! یہ محض تمہارا اندازہ ہے ۔ میں نے اُس وقت کچھ نہیں سوچا تھا " کلا نے انکار کیا ۔ مگر سدھیر کی نظریں جب اُٹھیں ، اُس کی گردن آپ سے آپ پھر جھک گئی ۔

" پھر وہ دن آیا ، جب تم اپنے گھر والوں کے ساتھ مسوری جا رہی تھیں ۔ "

" پتا نہیں ، شاید دو مہینے کے لیے " یہ تمہارا جواب تھا ۔ مجبوریوں میں ڈوبا ہؤا ۔

" میں بھی دو مہینے کے لیے کہیں چلا جاؤں گا ! " میں نے اُداسی سے جواب دیا " میرا بھی اس شہر میں کون ہے ، کلا ؟ "

یہ سن کر تم نے پلٹ کر ایسی پیار بھری ، شبنم کی بوند کی طرح کلیجے میں اتر جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ، میں بہت مجبور ہوں سدھیر - تمہیں ساتھ لے جا نہیں سکتی ، گھر والوں کو چھوڑ کر یہاں رہ نہیں سکتی اور وہاں مسوری کی شامیں مجھے زندہ نہیں رہنے دیں گی !

” یہ کون سی اینٹ تھی ، اور کس کے ہاتھوں نے رکھی تھی ؟ “ کلا نے ذرا ہنس کر ، ذرا مست ہو کر ، ذرا طنز سے پوچھا -

” جانے کلا یہ کون سی اینٹ تھی اور کس کے ہاتھوں نے رکھی تھی - میرے ، تمہارے یا دلوں میں بسنے والے خدا کے غیر مرئی ہاتھوں نے ... پھر نا معلوم ، نا محسوس طور پر اینٹیں رکھی جانے لگیں ... دیواریں ، فصلیں اٹھنے لگیں ...

پھر ایک بار جب تم نے اور ہم نے اکٹھے چونک کر دیکھا تو وہ عمارت تیار ہوچکی تھی - محبت کی عظیم ، ارفع اور سربلند عمارت ، جس میں ہمارے ، میرے اور تمہارے لہو کے چراغ روشن تھے -

صرف ایک آخری اینٹ رکھنی باقی تھی ...!

جبھی ہمارے جزیرے میں شک کی طغیانی آ گئی اور محبت کے سارے ایوان میں زلزلہ کے جھٹکے محسوس ہونے لگے -

گھر والے جان گئے کہ باتیں کرتے کرتے کلا کہاں کھو جاتی ہے ، کہ چلتے چلتے اس کے پاؤں رک سے کیوں جاتے ہیں ، کہ ہنستے ہنستے اس کی ہنسی کے پرند اپنی اڑان کیوں بھول جاتے ہیں ...!

کہ یہ میلا کچیلا ، عجیب سا آدمی ، موری کے پانی کی طرح بڑھتا بڑھتا دھلیز تک کیسے آ پہنچا ، کہ جس کی لا یعنی آمد پر دیواریں سرگوشیاں سی کیوں کرنے لگی ہیں ، دروازے سے آپ سے آپ کھلنے کیوں لگتے ہیں ...!

پھر یوں ہؤا کہ ایک دن جب ہم دونوں ہونٹوں کے شہتوت اور بانہوں کی قوس قزح کی دنیا میں کھوئے مافیہا سے بے خبر تھے ، تمہاری ماں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا ...!

پھر دروازے بند کر دیے گئے - تمہاری سانس پر پھرے بیٹھا دیے گئے - اور میرے سر پر ننگی تلواریں جھولنے لگیں -

” یہ دیس دیس کے راج کمار ہیں ، انہیں دیکھو ! “ بوڑھے

مہاراج نے اپنی جوان ، خوبصورت ، نازک اندام بیٹی کے کندھے پر محبت سے ہاتھ رکھا ۔

سامنے راج محل سے ملحق ، وسیع باغ کے بیچوں بیچ مسندوں اور کرسیوں پر بیٹھے ہوئے سجے سجائے راج کمار ، لبوں پر مسکراہٹ کی صبح روشن کیے اور دلوں میں آرزوؤں کی جوت جگائے انتظار کی جاتی بجھتی قندیل روشن کیے بیٹھے تھے ۔ شاخوں پر بہار کی کلیاں ہنس رہی تھیں ۔ ہوائیں خوشبو کے بادل لیے اٹھلاتی پھر رہی تھیں ۔ سارے میں ایک کیفیت ایک حسن بے پناہ بکھرا پڑا تھا ۔

زربفت ، قیمتی ، اطلس و کم خواب کے لباس ۔ گلے میں سجے موتیوں کی مالا ۔ کانوں اور انگلیوں میں چمچماتے ہیرے جواہرات ، چہروں پر وقار ، تمکنت اور سربلندی کا احساس ۔ ایک سے ایک جوان ، ایک سے ایک خوبصورت وجیہہ ، دل فریب ، دل کش !

سنجوگتا نے دیکھا ، اس کے ہاتھوں میں پڑی ہوئی ورمالا کے پھول افسردہ ہو گئے ۔ اس کے دھانی رنگ کے دوپٹے کی ریشمی کور ہوا کے ایک شریر جھونکے سے اڑ کر اس کی آنکھ میں چبھنے لگی ۔ اس نے کم خواب کے دھانی دوپٹے کو پرے پھینکا ۔ اس کی موتیوں جیسی آنکھوں سے پانی چھلک آیا ۔

اس نے پلٹ کر مہاراج کی طرف دیکھا ، جن کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی ، غضب کا وقار تھا ۔

'' ہاں بیٹی ! اچھی طرح دیکھ لو ۔ ملک ملک کے راج کمار براج مان ہیں ، جو تمہارے یوگیا ہیں ۔'' پھر مہاراج نے اپنی آواز میں باپ کی شفقت پیدا کی ۔ اور ایک ذرا بھاری آواز سے گویا ہوئے ۔ '' یہی ہمارے راج کی ریت ہے ، بیٹی جب جوان ہو جاتی ہے تو اس کے ہاتھ میں ایک مالا دے دی جاتی ہے ۔ یہ ورمالا کہلاتی ہے ۔ پھر اس کے سامنے اس کے یوگیہ پرش ہوتے ہیں ۔ جس کو وہ پسند کرے ، اس کے گلے میں ... !''

نازک ، خوبصورت اور کبوتر جیسے پاؤں ہرن کے چمڑے کی بنی گرگابی کے گھونسلے میں ڈوب گئے ۔ ہولے ہولے راج کماری نے سیڑھیاں طے کیں ۔ ساون بھادوں سی مست رفتار سے اس کے بدن کی شاخ گل لچکتی آگے بڑھی ۔ سرشار ہوا کے لاپروا جھونکے اپنی رفتار بھول گئے ... یہ سنجوگتا جا رہی ہے ... یہ راج کماری کا خرام ہے ... ذرا سنبھل جاؤ ۔

آسمان کی بلندیوں پر محوِ پرواز بگلوں کی روپہلی قطار ٹوٹنے سی لگی - نیچے دھرتی پر ، باغ کے اس کنج میں راج کماری سنجوگتا کا بیاہ ہے - پرندوں نے مسرت سے سرشار ہو کر پلٹ پلٹ کر یوں دیکھنا شروع کیا کہ ان کے پرواز کا حسن بکھرنے لگا اور ان کی ترتیب کی لے ٹوٹنے لگی کہ نیچے دھرتی پر سنجوگتا محوِ خرام ہے !

راج کماری کے قدم جیسے جیسے اٹھتے گئے ، فرش کے سبزوں کی گردنیں جھکنے لگیں - کنج میں کوئلیں کو کنا بھولنے لگیں - وہ جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی - راج کماروں کی پیشانیاں شکن آلود ہوتی گئیں - نگاہیں ہزیمت کی آگ میں جلنے لگیں - دلوں میں آرزوؤں کی شمع خاموش ہوتی گئیں مگر سنجوگتا کے پاؤں نہیں ٹھہرے ، اس کے خوابوں کا راج کمار تو کہیں نہیں — تو کہاں رہ گیا میرے راج ...!

پھر وہ باغ کے بڑے آہنی دروازے کو پار کر باہر آگئی - جوتوں کے پاس - راج کمار کے جوتوں کے ڈھیر کے پاس دیوار سے لگا ایک پتھر کا بت تھا - لمبی گردن اور چھوٹی غیور آنکھوں والا جوان ...!

کسی نے آہستہ سے کہا - " راج کماری ، یہ ہمارا دربان اور جوتوں کا رکھوالا ہے !"

ایک انگارہ سا سنجوگتا کے تلوے سے چھو گیا - احساس کی ردا کانپی ، دل کے کنول بجھنے سے لگے - مگر بے اختیار ہو کر وہ چیخ پڑی - بے رحم ، بے مروت ... میرے پتھر دل محبوب ...! وہ لپک کر آگے بڑھی اور پتھر کے اس بے حرکت بت سے لپٹ گئی - اس کے ہاتھوں نے جانے کون سے جذبے سے سرشار ہو کر ورمالا اس پتھر کی مورتی کے گلے میں پہنا دی اور سنجوگتا بے حال ہو کر بت سے لپٹ کر رونے لگی ...

تب ہی درختوں کے جھنڈ میں چھپی ہوئی مشکی گھوڑی نے رقص کے انداز میں اپنے چاروں پاؤں پٹکے - اس کی جلد کی مشکی ردا میں لہریں پیدا ہوئیں کہ سوار نیچے اتر آیا تھا - بھاری ، مضبوط اور پروقار پاؤں کی چاپ نے دھرتی کے سینے میں زلزلہ کا جھٹکا پیدا کر دیا - پھر وہ سوار چل کر عین راج کماری کے سامنے آ کھڑا ہوا -

" میں یہاں ہوں سنجوگ !"

سنجوگتا پلٹی — " تم !"

" ھاں میں ، تم نے میرے گلے میں مالا پہنائی ہے " اس نے اپنا قوی بازو اس کے آگے پھیلا دیا ۔ " اب تم میرے ساتھ ہو ۔ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتی !"

لپک کر راج کمار نے اس خاموش سنجوگتا کو اپنی آغوش میں بھر لیا ۔ سنجوگتا کانپی ، لرزی اور بے پناہ طوفان کے جھکڑ میں پھنس کر بولی :

" میرے ... میرے چوھان ... !"

" میرے چوھان ...!"

" میرے سدھیر ...!"

سدھیر ، اس کی زندگی ... سدھیر کی باھوں میں کتنا دم ہے ۔ اس کی آنکھوں میں کتنی زندگیاں کروٹیں لیتی رھتی ھیں ۔ سدھیر، اس کے خوابوں کا سدھیر ! جس کی ھر سانس اُس کی رگ رگ میں اُترتی ہے اور شمع جلاتی چلی جاتی ہے ۔ ایک سایہ سا اُس کے وجود پر مسلط رھتا ہے ، جو ھستی اور نیستی کے سارے فرق ، ساری دوئی مٹا ڈالتا ہے ۔

کلا نے کروٹ لی اور اس کی چھاتی پر ھاتھ پھیرتے ھوئے مسکرائی ۔ " کیا سوچ رہے ہو ؟ "

" اونھہ ..." سدھیر نے آسمان کی طرف تکتے ھوئے کہا ۔ اور پھر کھو گیا ۔

" بولو نا سدھیر! تم چپ رھتے ھو تو لگتا ہے جیسے ... جیسے تم بہت دور چلے گئے ھو ... کچھ بولو نا ..."

" کلا ، میں سوچ رھا ھوں ، یہ میں اور تم ، یہ مٹی ، یہ شعلہ ، یہ راکھ ... یہ ھستی کے سارے لچھن ، یہ سب فنا ھو جائیں گے ۔ سب مٹ جائیں گے ۔ خلاء کی پنہائیوں میں گم ھو جائیں گے ۔ اس عالم امکان کے سارے اثبات ... کچھ بھی باقی نہیں بچے گا ۔ ھستی کا تار تار بکھر جائے گا ...!"

کلا اُٹھ بیٹھی ۔ " یہ آج تم نے پی تو نہیں لی ہے سدھیر ؟ یہ کیسی سڑی گلی فلاسفی لے بیٹھے ، یہ آج کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ھو ۔ ھم آج کے انسان ھیں جو زندگی کو نعمت سمجھتے ھیں اور بس ... سب کچھ ختم ھو جائے گا تو باقی کیا بچے گا ؟"

" باقی بچیں گے ھم ! میں اور تم ...!" سدھیر کھلکھلا کر ھنس پڑا ۔ " آتما !" سدھیر نے اپنے سینے پر ھاتھ رکھتے ھوئے

کہا ۔ " اور یہ پرم آتما !" پھر کلا کے سینے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیا ۔

وہ اٹھ بیٹھا ۔ اس نے کلا کا سہارا لے کر آرام سے سگریٹ جلایا اور دھواں کلا کے چہرے پر انڈیل دیا ۔

" جذبہ ! جذبہ ، کلا صرف ایک جذبہ ! جو لپک کر بڑے والہانہ انداز میں بڑھتا ہے ۔ جذبہ! جو جھپٹ کے اسے قبول کرتا ہے ۔ پھر دونوں مل کر ایک ہو جاتے ہیں ۔ جیسے بیج ٹوٹ کر دھرتی کی اور گرتا ہے اور دھرتی جو والہانہ انداز سے اپنی کھوکھ میں دبوچ لیتی ہے ۔ جیسے میں بے تابانہ تمھاری طرف بڑھتا ہوں اور تم پاگل سی اپنی آغوش میں مجھے چھپا لیتی ہو ۔ جیسے آتما سرمستی کے عالم میں پرم آتما سے ملتی ہے اور پھر دونوں ایک ہو جاتے ہیں ۔ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں ....!

نہ آگے نہ پیچھے ، نہ دائیں نہ بائیں ، کہیں کوئی نہیں ہوتا نہ اوپر نہ نیچے ، نہ دھرتی نہ آکاش ، نہ دیواریں نہ قفس ... فقط سانس چلتی ہوتی ہے ، فقط سانس ... گہری ٹوٹتی ہوئی، بکھرتی ہوئی... کسی کو کچھ پتا نہیں چلتا کہ کس نے کس کو آواز دی ، کس نے کس کو پکارا ... فقط ایک بازگشت ہوتی ہے ۔ اور بس ... اور بس ... !!

کوئی کسی کا جواب نہیں ، کہیں کسی کا جواب نہیں ۔ صرف ایک صدائے بازگشت ، فقط ایک گونج ــ !"

" کلا ، میں کبھی کبھی اپنے آپ کو ڈھونڈھتا ہوں ۔ بہت پکارتا ہوں ۔ مجھے کہیں پتا نہیں چلتا ، کوئی اتر نہیں ملتا ۔ کسی دشا سے بھی ــ !"

" اور میں بھی !"

" تب میں کہاں ہوتا ہوں ؟ تمھیں پتا ہے کلا ؟؟"

" مجھے اپنا بھی پتا نہیں ملتا !"

پھر بہت دیر خاموشی چھائی رہی ۔ سامنے سمندر بپھرتا ، گرجتا جھاگ اگل رہا تھا ۔ سمندر کے کنارے بھیگی بھیگی ریت پر وہ دونوں لیٹے رہے ۔ ہواؤں کے لالچی پرندے کلا کے سیاہ بالوں کو چومتے رہے جنھیں سدھیر بار بار درست کرتا رہا ۔

پھر سدھیر چت لیٹ گیا ۔ " کلا ــ !" وہ کھلے آسمان کی طرف دیکھتا رہا جہاں اندھیرا ہی اندھیرا بکھرا پڑا تھا ۔ کبھی کبھی

بگلوں کی قطار چاندی کی لکیر کی طرح سرسراتی گزر جاتی ۔ ایک آن جانا ، آن دیکھا ، غیر محسوس حسن آنکھوں کے سامنے سے گزرتا ۔ جیسے کلا کا خوبصورت ننگا ہاتھ فضا میں ، سرمستی کے انداز میں لہرا لہرا جائے ۔

" ہوں !" کلا اس کی چھاتی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی : "کیا سدھیر ؟"

" معراج کا علم ہے تمھیں ، جب آتما پرم آتما سے ملتی ہے ؟"

" نہیں ، بتاؤ مجھے ۔" اس نے بچوں کی طرح پوچھا ۔

" بندہ اپنے بستر پر لیٹا ہی تھا ، ابھی آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ کسی نے نیستی سے بھی پرے سے آواز دی ۔ میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں ، تم کہاں ہو ؟"

" بندے کے لبوں پر پاکیزگی مسکرا پڑی ۔ جواب دیا ۔ آرہا ہوں ... اور وہ چلا گیا ۔"

"کہاں ؟"

" خدا کے پاس !" پھر سدھیر چپ ہو گیا ۔ ایک دم سے ساکت جیسے آتما کو پرم آتما سے ملنے کا نظارہ کر رہا ہو ۔ پھر کئی خاموش منٹ گزر گئے ۔ تب کلا نے پوچھا ۔

" پھر کیا ہؤا ؟"

سدھیر چونک کر اٹھ بیٹھا ۔ ایک ذرا ناگوار سا لگا ۔ پھر اس نے اپنی جیب سے سگرٹ نکالا ، جلایا اور ایک گہرا کش لے کر دھواں آسمان کی طرف پھینک دیا ۔

"کہتے ہیں ابھی وہ بستر گرم تھا ، دروازے کی زنجیر جنبش کناں تھی ، قدموں کی چاپ نے دم بھی نہیں لیا تھا کہ پرم آتما نے آتما سے کہا ۔ اب تم جاؤ ۔ بہت دیر ہو گئی ... تمھیں پتا ہے صدیاں گزر گئیں ...! تب بندہ واپس آگیا ۔

"اس نے دیکھا ، نیچے زنجیر ابھی تک ہل رہی تھی ، بستر ابھی گرم تھا ! بندے کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی ۔ یہاں یہ عالم ہے اور وہاں میں صدیاں گزار آیا ... ان صدیوں کے درمیان جب آتما پرم آتما سے مل رہی تھی ، جانے خدا نے کتنی بار اپنا نام لے کر پکارا ہو ۔ جانے بندے نے کتنی بار اپنے آپ کو آواز دی ہو مگر کہیں کوئی ہو جب نا کسی کو کوئی جواب دے ۔ ایک دوسرے کو صرف اپنا نام بازگشت میں سنائی دیتا ۔ اور کچھ

نہیں ... کچھ بھی نہیں ...!

"اس گھڑی ، وقت چلتے چلتے رک جاتا ہے - آگے والا وقت آگے کی طرف ، پیچھے سے آنے والا سمٹے پیچھے کی جانب ، خاموش ، لبوں پر انگلیاں رکھے ، انہیں مت چھیڑو ، انہیں مت چھیڑو ...!"

ناریل کے پتوں میں ہوا سرسرائی تو کلا نے دیکھا کہ وقت تو بہت گزر گیا ہے - اور چاروں اور اندھیرا امڈ پڑا ہے - جس میں آس پاس کی روشنیاں مسکرا رہی ہیں ... انہیں مت چھیڑو ... انہیں مت چھیڑو ...

"چلو سدھیر بہت دیر ہوگئی - آج کسی اچھے سے ہوٹل میں بہت اچھا سا کھانا کھائیں گے !"

"بہت اچھی سی کلا کے بہت اچھے اچھے ارمانوں کو میرا بوسہ !"

سامنے سمندر کے تاریک سینے پر رات کا سناٹا بڑھ رہا تھا - خاموشی سے ہستی کے چاروں کھونٹ اپنے خیمے نصب کر دیے تھے - باہر سمندر نیند کے کہرے سے آہستہ آہستہ کروٹیں بدل رہا تھا - سارے عالم پر نیند ہی نیند طاری تھی — مگر شانتی نواس ہوٹل کے ایک کمرے میں دو جسم اب بیدار ہو رہے تھے - آہستہ آہستہ ، کسی پرانی شراب کے نشہ کی طرح ، کھڑکی سے جھوم جھوم کر ہوائیں آ رہی تھیں اور کلا کے خشک ، سیاہ لمبے بالوں کی ساری خوشبوؤں کو بکھیرے دے رہی تھیں - ایک پتلی ریشمی چادر میں کلا کا ریشمی جسم ہولے ہولے کھولنے لگا تھا - ادھر سدھیر کی لمبی موٹی انگلیوں میں لمس کی ہوس جاگنے لگی تھی ...

پھر دفعتاً سدھیر نے ایک جھٹکے سے اس ریشمی چادر کو کھینچ لیا - جس نے حسن کے ایک جہان کو چھپا رکھا تھا - نور کا ایک سمندر تھا ، امڈ پڑا - بجلی کی روشنی میں نہاتا ہوا چاندی کا بدن ، برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ کی طرح چمکا اور سدھیر کے ساتوں طبق کو روشن کر گیا - تب کلا نے اپنے دونوں جہان کو ، خوبصورت بازوؤں میں چھپانے کی کوشش کی اور کھل کھلا اٹھی - سدھیر نے گہری نظروں سے دیکھا اور سرشار ہو گیا -

"کلا!" سدھیر اس کے سڈول بازوؤں پر انگلی پھیرتے ہوئے بڑی مشکل سے بولا — "کلا ...!" اس کی آواز کو ایک جھکڑ

نے راستے ہی میں روک لیا ۔

'' ہاں !'' کلا ہستی کی سرزمین سے پاؤں اٹھا چکی تھی ۔

'' جانتی ہو ، سورگ کسے کہتے ہیں ؟'' سدھیر کی انگلیاں چپ سادھے کسی ہوشیار عاشق کی طرح اس کے جسم کو چوم رہی تھیں ۔

کلا نے کچھ جواب نہیں دیا ۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں ۔ جانے کون سی کوہِ ندا اسے پکار رہی تھی ۔ جانے اس کے سمندر پر کس غوطہ خور کا سایہ پڑ رہا تھا !

''کہتے ہیں دیہنہ کا سورگ ہی اصل سورگ ہے ... !'' اس نے نیم بسمل پرندوں کی طرح تڑپتے ہوئے لب کلا کی ناف پر رکھ دیے ۔ '' جسم کی جنت !''

کلا تڑپ گئی ۔ جانے کن ہاتھوں نے اسے اٹھا کر فضا میں اچھال دیا ۔ جہاں وہ گلاب کی پتیوں کی طرح بکھر گئی ۔ اس کے ہونٹ کانپے ، تھرتھرائے ، بڑی مشکل سے اس نے مرتعش آواز میں کہا ۔ '' سدھیر میں مر جاؤں گی !''

اس کے دونوں ہاتھ آپ سے آپ شانوں سے الگ ہو گئے ۔ پھر سب کچھ پتا نہیں کہاں گم ہو گیا ۔ یہ شرم و حیا ، یہ میں اور تم ... ساری دوئی مٹ گئی ۔ کلا نے اپنے دونوں جہان اس کے آگے پھیلا دیے ، گویا کہہ رہی ہو ، یہ سب تمہارے ہیں ....!

سدھیر نے ایک مست نظر سے اس پھول سے بدن کو دیکھا اور اپنا چہرہ کلا کی دونوں دنیاؤں کے بیچوں بیچ دفن کر دیا ۔

ہر شئے کیا ہے ؟ جو گرفت میں آ جاتی ہے وہ اپنا جمال کھو بیٹھتی ہے !

ہر شئے کیا ہے ؟ کچھ پھیکی پھیکی ، کچھ سیٹھی سیٹھی ۔ ہر جمال ذرا سی بدصورتی لیے پھرتا ہے ۔ جب دور رہتا ہے تو جمال ہی جمال ہے ، حسن ہی حسن ہے ۔ جب گرفت میں آ جاتا ہے ، ایک دم سے قریب آ جاتا ہے ، بدصورتی کی ہلکی سی تہہ چھپائے نہیں چھپتی ۔ لاکھ غازہ ملو ، سرخی لپیٹو ، کہیں نہ کہیں سے کسی نہ کسی چور دروازہ سے جھانک ہی لیتی ہے ۔ کلا نے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے دور تک پھیلی ہوئی کروٹیں لیتی ہوئی سطح کو دیکھا ۔ جب ہی سدھیر کبھی کبھی ایک بے اختیار جذبے کی تحت کہہ اٹھتا ہے کہ میں پھیکی پھیکی سی ، سیٹھی سیٹھی سی دکھتی ہوں ۔

یہ افسردگی جو زندگی کے لہلہاتے ہوئے پھولوں کی کور میں چھپی رہتی ہے ، کہاں سے آئی ہے ؟

کلا اپنے دونوں بازوؤں پر زور دے کر کھڑکی پر جھک گئی — شاید یہی حقیقت ہے ۔ عالم کی ہر شئے نامکمل ہے ۔ ایک کمی ، جو ہستی کو مکمل نہیں ہونے دیتی ، شاید اس کے اثبات کا انحصار اسی میں ہے ۔ ایک خلش ، آسودگیوں کی بہتات میں ہلکی سی ناآسودگی ، جیسے یہ وسیع سمندر ، یہ پانیوں کا ذخیرہ ، جس کی لہریں پیاسے پرندوں کی طرح بیچوں بیچ سے آٹھتی ہیں اور ویسے ہی پیاسی ، تڑپتی ، ساحل سے ٹکرا کر بکھر جاتی ہیں ... !

گھٹائیں لاکھ آٹھتی ہیں ، بادلوں کے جھنڈ کے جھنڈ آٹھتے ہیں ۔ سیاہ گھرے گھرے بادل برستے ہیں ، برستے ہیں ، لگا تار برستے رہتے ہیں ۔ سمندر کے پیاسے جسم پر بوندیں اختلاط کے نغمے بکھیرتی رہتی ہیں ۔ ہر طرف وصال کی کیفیت طاری رہتی ہے ۔ ہوائیں جھومتی ہیں ۔ فضاؤں کی سانس میں تعطر پھیل جاتا ہے ۔ سمندر کا وجود بھیگتا رہتا ہے مگر پیاس ہے کہ ذرا یہ بوندیں رکیں، کہیں نہ کہیں سے چمک آٹھتی ہے ۔

کلا نے اپنے تخیل کے اسپ تازی کو ایڑ لگائی ۔ وہ کیا سوچ رہی ہے ۔ وہ کہاں پہنچ گئی ! اس کا لا شعور بڑا چغل خور ہے ۔ مگر ... مگر وہ کیوں ایسا سوچنے پر مجبور ہے کہ جو کچھ سدھیر دیتا ہے ، آس سے اس کی جھولی نہیں بھرتی ۔ ذرا سی سہی ، مگر خالی رہ جاتی ہے ۔ کاش وہ اپنی بے انتہا دولت میں سے مٹھی بھر اور دے دیتا جس سے آس کا پیالہ بھر جاتا ۔ بھر کے آمڈ جاتا ... لیکن پھر بھی اس کمی کے باوصف سدھیر اسے بہت پیارا لگتا ہے ۔ ایسا جان لیوا محبوب جسے دیکھ کر اس کا سمندر کروٹیں لینا بھول جاتا ہے ... ! پھر کلا نے سوچا ، یہ معمولی شکل و صورت کا آدمی ، یہ بیار بیار سا بجھا بجھا انسان ، وہ کیوں اتنا تباہ کر دینے کی حد تک اچھا لگتا ہے ۔ جو اس کا دامن بھی نہیں بھر سکتا !

شاید یہ تکمیل کی ہوس ہے ۔! شاید آج سدھیر اسے نہال کر دے گا ۔ شاید آج ... جو سیاہ بدھیت بادلوں کو دیکھ کر سمندر کے سینے کو خوشیوں سے بھر دیتی ہے — تکمیل کی ہوس جو انسان کی خواہشوں کا راج کمار ہے ، جو کبھی نہیں ملتا ۔ خوابوں میں رستا بستا ہے اور وہیں ایک نہ ایک دن کھو جاتا ہے ... ! پھر کلا

چونک کر ٹھہر گئی - کیا کھو بھی جاتا ہے ؟ کبھی نہیں ملتا - ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا ؟

مگر وہ اتنی بے چین کیوں ہو جاتی ہے ؟ کلا نے پھر سوچا ، جو انسان کے مقدر میں نہیں ہے وہ نہ ملے - ایسا اضطراب کیوں ، یہ تڑپ ... یہ بے قراری ... شاید یہ تکمیل کی ہوس نہیں ، شاید یہ ہوس کی تکمیل کا جذبہ ہے جو اسے اتنا چاہنے والے محبوب کی آغوش میں بھی دم نہیں لینے دیتا ، جو وصال کے وقت بھی کبھی کبھی چھو کر گزر جاتا ہے !

" مگر " کلا پھر رکی - " کیا یہ کمی سدھیر کو بھی محسوس ہوتی ہے؟ اس نے کبھی اس کی طرف جھانک کر دیکھا تو نہیں - شاید اس کے تھکے ھارے پرند کو بھی وہ شاخ نہیں ملی ہو جو اس کا وزن سنبھال سکے ، جو جھکے نہیں ... کبھی اس نے پوچھا تو نہیں - کبھی جاننے کی ضرورت تو نہیں محسوس کی ...

" یہ پیاس کیوں ہے ؟ "

سامنے بے قرار سمندر کی سطح پر سلوٹیں پڑیں - پھر اس کے وجود کو بکھیر کر رکھ دیا - کلا کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیلی - سمندر بھی کلا کی زندگی کی طرح خود غرض ہو گیا ہے - اسے بھی کچھ اور چاہیے- اس کی ہستی پر چھایا ہؤا یہ گھرا آسمان برس برس کر تھک جاتا ہے ، جب بھی اس کی آتما کی پیاس نہیں بجھتی - ایک نا کام سی جستجو ، ایک فضول سی خواہش اسے بھی تڑپاتی رہتی ہے - اس کے جیون سے سمندر کو کتنا گھرا ربط ہے ، کتنا اٹوٹ سمبندھ ...!

یا خود اس کی زندگی کیسی سامدرک ہوگئی ہے - کوئی غوطہ خور کتنا گھرا اترتا ہے - اس کے پاتال کے سارے سیپ ، مونگے ، موتی کو بٹورتا ، سمیٹتا ، نہارتا نہیں تھکتا - مگر پھر بھی کچھ باقی رہ جاتا ہے - کوئی موتی کسی بھاری پتھر کے نیچے دبا ، وصال کے لمس سے محروم رہ جاتا ہے - کہیں ایک مونگا چھوٹ جاتا ہے — سدھیر ! جیسے تمہارا لمس ، بے قرار لمس بھی نہیں پہنچ پاتا ...!

کلا نے ٹھہر کر ، سنبھل کر ایک ذرا متوازن ہو کر سوچا ، میرا سیپ تو بے قرار رہتا ہی ہے سدھیر ، شاید ... شاید تمہارا لمس بھی لذت کے اس موتی کو چھو نہیں پاتا جو مجھ میں بند ہے ، میرے سیپ میں بند ہے ...!

چھ دنوں کی بے رحم قید ـ! کلا مسکرائی ـ نا کردہ گناہوں کی عجیب سزا ...!

ہر مہینے بلوغت کے چاند کو چھ دنوں کے لیے راہو نگل لیتا ہے ـ بلوغت گہنا جاتی ہے ... یہ عجیب دستور ہے فطرت کا ـ

اس نے کھڑکی پر کہنیوں کا بوجھ دے کر سمندر کی طرف دیکھا جس کا جوار بھی کئی دنوں بعد ختم ہو چکا تھا ـ وہ شانت تھا ـ ایسے ہی جیسے آج صبح سے کلا شانت تھی ـ اس کا چاند راہو کے کٹے ہوئے گلے سے نیچے اتر آیا تھا ـ اپنے آپ کو صفائی سے بچاتے ہوئے ـ

آج سب کچھ صاف تھا ـ اندر ، باہر ، فضا نتھری نتھری تھی ـ ہوا دھلی دھلائی سی بہہ رہی تھی ... کلا نے آسمان کی سمت نگاہیں کیں ـ وہ بھی صاف تھا ـ اس نے آنکھوں کے سامنے پھیلے ہوئے لامحدود ، بے کراں سمندر کو بھی دیکھا ـ وہ بھی بے داغ تھا ـ نہ آسمان کے سمندر میں کوئی جوار تھا ، کوئی طوفان ، کوئی چھوٹی سی کشتی کا پھڑپھڑاتا بادبان تھا ـ نہ سمندر کے آسمان میں کوئی بادل ، کالے ، سفید ، ملگجا بادل رواں تھا ـ

لگتا تھا ، آسمان نے جھک کر سمندر کے کٹورے میں اچھی طرح منہ دھویا تھا !

لگتا تھا ، سمندر نے ہاتھ بڑھا کر آسمان کے چہرے کی خاک پونچھی تھی !

کلا کے سارے سیاہ بالوں کا سمندر اس کے شانوں پر جھک آیا تھا ـ اس نے ہاتھ بڑھا کر بے قرار ، اس کے محبوب سدھیر کی طرح بے قرار بالوں کو اپنے شانوں پر پھینک دیا اور ہولے سے مسکرائی ـ

”آج ... آج سدھیر کو مار ڈالوں گی !“

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا ، دور بہت دور ، جہاں سمندر اور آسمان گلے مل رہے تھے ، وہاں آگ لگی ہوئی تھی جو ہولے ہولے پھیل رہی تھی ـ کلا کھو سی گئی ـ عجیب منظر تھا ـ دھیرے دھیرے ، جیسے اچھوتے ارمانوں کی طرح آسمان اور سمندر کے بیچوں بیچ والی لالی ، گہری خوش گوار ہوتی جا رہی تھی اور اب ذرا دیر میں سارا سمندر لال ہو رہا تھا ـ دھکتا ہوا ـ جیسے سمندر نہ ہو شراب سے چھلکتا ہوا پیالا ہو ـ

وہ کھو سی گئی - اپنے آپ کو دھیرے دھیرے گم ہوتے اس نے دیکھا مگر کہاں کھو گئی - اس کا اسے پتا ہی نہیں ...

جب ہی کسی نے اس کے بھرے بھرے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیا - دفعتاً وہ چونکی - اس نے پلٹ کر بڑے اعتماد سے دیکھا -

سدھیر ہی تھا -

"کیا دیکھ رہی ہو ؟"

مگر کلا نے کوئی جواب نہیں دیا - گویا سنا ہی نہیں -

اس نے محبت سے ، بے پناہ محبت سے سدھیر کے چہرے کی طرف دیکھا - سانولے سانولے سوکھے چہرے پر بھی شفق کی لالیاں بکھری ہوئی تھیں -

پھر اس نے سدھیر کے بالوں کو دیکھا ، وہ بھی لال تھے - سفید کپڑوں میں گویا آگ لگی ہوئی تھی -

پھر اس نے کمرے میں ٹنگے پردوں کو دیکھا ، صوفے کو ، پلنگ کو ، دیواروں کو ... سب کی سب لال سرخ ہو رہی تھیں - ساری دنیا ، سارا عالم لال ہی لال تھا - کلا مسکرائی - پھر اس کی آنکھیں سدھیر کے چہرے پر ٹک گئیں -

"میں نے کہا ، کیا دیکھ رہی تھیں !" سدھیر نے دھیرے سے کہا -

"لالی !" کلا نے مسکرا کر لگاوٹ سے اس کی طرف دیکھا - پھر شفق کی جانب دیکھا ، پھر سمندر کو دیکھا ، پھر مانو سارے عالم کو دیکھتے ہوئے اس کی خوبصورت آنکھیں پھر سدھیر کے چہرے پر ٹک گئیں اور وہ ذرا پیچھے ہو کر دھیرے سے بے خودی کے عالم میں مسکرائی - اس کے لب ہولے سے ہلے -

"لالی — لالی میرے لال کی ...!"

اس نے شفق کو پھر دیکھا اور سارے عالم پر نظریں ڈالتی ہوئی پھر وہیں آ گئی "کہ جت دیکھوں ، آت لال" ...

پھر دونوں ہاتھ کو پرواز کے انداز میں کھول دیا اور جھپٹ کر سدھیر کو اپنی آغوش میں بھر لیا "لالی دیکھن میں گئی ...!"

اس کی آواز کی بادصبا راستہ ہی میں بھٹک گئی تو سدھیر نے اپنے دونوں بازوؤں میں اس کے وجود کو لپیٹتے ہوئے جذبات کے عالم میں ، سرگوشیوں کے انداز میں کہا "کہ میں بھی ہو گئی لال ..."

اور دھیرے سے اُس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے جیسے سرخ آسمان ، سرخ سمندر کے پیالے میں ڈوب گیا ہو ۔

ہستی کا ذرہ ذرہ عالم کے کن کن میں گلال اُڑا رہا تھا جیسے نیستی نے ہستی کے وجود سے پہلی بار کھل کر ہولی کھیلی ہو ۔

ذرا دیر بعد جب کلا کے پاؤں اکھڑنے لگے ، وہ جلدی سے الگ ہو گئی ۔

"چلو ... آج میری معیاد ختم ہوئی ، چلو کہیں گھوم آئیں!"

"کلا ! اس گلابی ساڑھی میں تم بہت اچھی لگ رہی ہو !"

کلا مسکرا پڑی ۔ اس نے ایک بار اپنے آپ کا جائزہ لیا اور اپنے ریشمی آنچل کو گردن کے گرد پھینکتے ہوئے گھاس کے قطع پر لیٹ گئی ، پھر عجیب سی سرمستی کے عالم میں پلٹتی ہوئی بالکل اس کے قریب آکر کھل کھلا پڑی ۔

"کیسی لگتی ہوں ؟" اس نے بڑے پیار سے سوال کیا جیسے اگر سدھیر کا جواب صحیح ہؤا تو انعام میں وہ جانے اُسے کیا دے بیٹھے گی ۔

مگر سدھیر کے جواب دینے سے پہلے اُس نے اس کے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ دیں ۔

"میں جانتی ہوں ، تم کیا بولو گے !"

"کیا ؟"

"اپسرا ، جیسے دھنک ، جیسے سرو ... !"

"نہیں ! جیسے کلا ... جیسے کیٹس کی کوئی نظم ... جیسے برندا بن میں کھوئی ہوئی بانسری کی لے ... جیسے گلال میں نہایا ہؤا تاج ... جیسے خود تم کہ جس کی کوئی مثال نہیں ...!"

"بس سدھیر !" اس نے آنکھیں بند کر لیں ۔ اس کے تصور میں گلال میں نہایا ہؤا تاج محل تھا ۔ اس کی کلپنا میں کوئی کلا تھی جسے خود اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا ، نہیں جانا تھا ، نہیں چوما تھا ۔

سدھیر اس کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس کے لمبے خشک سیاہ بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا ۔ کلا کی آنکھیں بند رہیں ۔ اس کے کانوں میں کچھ لرزتی آواز آئی ۔

"اور یہ تمہارے بال کلا !"

"تم کہو گے دھنکی ہوئی رات !"

"نہیں ! جیسے برسات میں بھیگا ہؤا جنگل ، جیسے کسی بے گناہ کی طویل سزا ۔ جیسے جدائی کا وہ خیال جو کبھی کبھی میرے احساسات کو گھیرے رہتا ہے !"

کلا چونک کے اٹھ گئی ۔ "یہ تم نے کیا کہہ دیا ؟ تم سے کون مجھے الگ کر سکتا ہے !"

"وقت ! جس کے بے شمار چہرے ہیں ۔ ان گنت ہاتھ ہیں ۔ میرا دل کہیں تاریک رات میں بھٹک جاتا ہے ، جب میں سوچتا ہوں کہ تم کل میرے پاس نہ ہو گی !"

کلا نے گہری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے گہری آتر کر کہا ۔ "اور اگر میں آج تمہاری آغوش میں مر جاؤں ؟"

سدھیر نے اس کے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ دیں ۔ لیکن آہستہ سے کہا بھی ۔ "مگر مجھے یہ پسند ہے ۔ میری خود غرض محبت کو یہ گوارا ہے !"

کلا نہال سی ہو گئی ۔ اس پر کئی بوتلوں کا نشہ چھا گیا ۔ اس نے تڑپ کر عجیب جان لیوا نظروں سے اس کی طرف دیکھا ۔

"محبت خود غرض نہ ہو تو مکمل بھی نہیں ہوتی !" اس نے اپنے لمبے بالوں کو سر سے پرے پھینکتے ہوئے کہا "میرا بھی کبھی کبھی جی چاہتا ہے سدھیر ، تمہیں اپنی آغوش میں اتنی زور سے بھینچوں ، اتنی زور سے کہ تمہارا دم نکل جائے ۔ وہیں میرے بازوؤں میں تم مر جاؤ ۔ اور وہیں اپنی آغوش میں تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر لوں ۔ تا کہ کوئی تمہاری مٹی کو بھی مجھ سے نہ چھین سکے !"

سدھیر نے بے حال سا ہوکر اس کو اپنی گود میں بھر لیا ۔ کئی بے قرار لمحے گزر گئے ۔ زلزلے کے کتنے جھٹکے آئے ۔ پھر دنیا ذرا ٹھہری ۔ سدھیر کی بے قرار انگلیاں اس کی پشت پر پھرتی پھراتی بلاؤز کی بٹن پر رک کر چومنے لگیں ۔ پھر ذرا کی ذرا میں ایک بٹن کھل گئی ۔

"ارے یہاں !" کلا نے آہستہ سے تأمل کیا ۔

"ہاں !" دوسری بٹن بھی کھل گئی ۔ "یہاں ، اسی وقت !"

"مگر لوگ آ جا رہے ہیں اور ابھی آجالا ...!" مگر کلا کے پاؤں بھی اکھڑ چکے تھے ۔

"مجھے پروا ..." سدھیر کی آواز بکھر گئی - اس کی انگلیاں تیسری بٹن بھی کھول چکی تھیں - پھر جب ذرا دیر بعد کلا کے شانے پر ، اس کے دونوں ہاتھوں نے بلاؤز کو الگ الگ تھام لیے، تو خود کلا جو اب تک جھجھک رہی تھی ، ایک کیفیت میں اس کی آغوش سے ذرا پیچھے ہو گئی - اور بلاؤز سارا کا سارا سدھیر کے ہاتھوں میں آگیا - ساڑی کا پلو گر گیا تھا - سپردگی نے ساری شرم مٹا دی تھی - کلا کی آنکھیں بند تھیں -

سدھیر نے دیکھا ، ابھی سورج ٹھیک سے ڈوبا بھی نہیں تھا - فضا میں روشنی تھی - کلا کا اوپری جسم بریسیر کی قید سے بھی آزاد تھا اور کلا کا دودھیا رنگ جو ڈوبتے سورج کی لالی سے گلنار ہو رہا تھا ... اس نے لپک کر کلا کو اپنی آغوش میں چھپا لیا - سامنے ایک بوالہوس آدمی اسے دیکھ رہا تھا - اس نے آہستہ سے کلا کے کان میں کہا - "کوئی آدمی دیکھ رہا ہے !"

"دیکھنے دو !" کلا کے پاؤں نیستی سے بھی پرے پڑ رہے تھے -

ساری فضا شرابی ہو گئی - سانجھ سنولا گئی - آہستہ سے سر کے کلا اس کے ہاتھوں سے نیچے گھاس کے فرش پر یوں پھیل گئی جیسے موتیوں کی لڑی گر پڑی ہو - بے حال سی کلا آنکھیں بند کیے فراق کی مدھ بھری رباعی کی طرح ہانپنے لگی -

زمانہ پل بھر کو لڑکھڑایا - پھر سست رفتار سے آگے بڑھ گیا۔

ایک وسیع ، بادلوں سے اٹے ہوئے آسمان کی طرح ، سدھیر نے کلا کے مغرب و مشرق کو یوں ڈھک لیا کہ ھستی اور نیستی دونوں کراہ کر رہ گئیں !

کلابہ کے پر شور ماحول اور جگمگاتی شام سے نکل کر جب وہ الفنسٹن روڈ کی طرف مڑے ، جب بھی دونوں خاموش تھے۔ خاموشی سے دونوں کے قدم فٹ پاتھ پر یوں پڑ رہے تھے ، جیسے چلتے چلتے کبھی ، کسی وقت رک بھی سکتے ھیں - باتوں کے پرند ، ناتوانی سے سر نہوڑے ذھن کے ویرانے میں بیٹھے اونگھ رہے تھے - رہ گذر خاموش تھی - نہ دھول اڑ رہی تھی ، نہ جھکڑ چل رہے تھے ، گویا ابھی ابھی بارش ہوئی ہو ، ساری دھول بیٹھ گئی ہو - ساری فضا صاف ہو مگر کبھی کبھی کوئی سوندھی مہک کا بھبھکا اٹھ

جاتا - تب چلتے چلتے کلا پلٹ کر یوں اسے ایسے دیکھ لیتی کہ خود سدھیر اسے دیکھتے ہوئے دیکھ نہ لے - پھر بہت دیر ہو گئی تو کوئی پرند پھڑپھڑایا -

''اس دن ماں کی طبیعت بہت خراب تھی ! '' کلا نے نگاہیں نیچے کیے کیے آہستہ سے کہا - '' جانے اب کیسی ہو ؟ ''

پہلو سے ایک تیز رفتارخوبصورت کار زن سے نکل گئی - دونوں نے دیکھا ، ایک دھانی رنگ کا دوپٹہ کھڑکی سے لہرا رہا تھا - قریب سے ایک بدصورت مرد اور عورت زور زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے آگے بڑھ گئے -

وہ خاموشی سے بدستور چلتے رہے - آس پاس کے شور سے الگ تھلگ دونوں تنہا تنہا سے ...

پان کی ایک چھوٹی سی دکان کے سامنے دونوں کے پاؤں رک گئے - سدھیر نے اور کلا نے ، دونوں نے ، یکبارگی آئنے میں ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک عجیب سا ملتا جلتا رنگ دونوں کے چہروں پر بکھر گیا ، پھر دونوں مسکرا پڑے ، پھر جانے کیوں کیسے اور دونوں ہنس پڑے -

پان والے نے ذرا ہو کھلا کر کہا - '' جی باؤجی ! ''

'' دو پان - ''

'' میرے لیے زردہ اور ان کے لیے میٹھے مسالے والا - ''

پھر دونوں چل پڑے - وہی خاموشی گوارا سی ، چپ ، آس پاس کے شور و غل سے الگ تھلگ وہ دونوں اپنی اپنی دنیاؤں میں کھوئے کھوئے جانے کیا ڈھونڈتے رہے -

'' ڈھونڈتے ڈھونڈتے کھو جانا سنا تھا ! '' کلا نے جانے سدھیر سے کہا کہ اپنے آپ سے پوچھا - '' کھوئے کھوئے کسی چیز کو ڈھونڈتے نہیں دیکھا تھا ! '' پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی -

'' یہ کون سی چیز تم ڈھونڈ رہی ہو ؟ '' سدھیر نے اس کی ہنسی کا کوئی نوٹس نہیں لیا - دفعتاً وہ چونک پڑا -

'' میں نہیں تم ڈھونڈ رہے ہو ! '' کلا نے اطمینان سے جواب دیا -

'' یا تم ڈھونڈ رہی ہو ؟ '' سدھیر کو اس کا اطمینان بے جان کمزور اور کھوکھلا نظر آ رہا تھا -

'' ہم دونوں ! '' کلا نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا -

” وہ چیز مل جائے تو وہ نوے کی نوے اینٹیں شاید ایک دن میں مضبوط بلکہ مضبوط تر ہو جائیں !“

” کون سی چیز ؟ کون سی چیز تم مجھ میں ڈھونڈ رہی ہو جو تمھیں نہیں ملتی ؟“ سدھیر نے پہلی بار قدرے ناگواری سے کہا۔ اس کی تیوریوں پر کئی بل پڑ گئے۔

” وہی جو تم مجھ میں ڈھونڈتے رہتے ہو !“ کلا نے کمال ضبط اور صاف گوئی سے کہا۔ ” اور تمھیں بھی نہیں ملتی !“

سدھیر سناٹے میں آگیا۔ حقیقت ایک ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح اس کے سامنے پڑی تھی۔ اس کے لب پھڑپھڑائے ، پھر تھم گئے۔ اس نے جلدی سے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور سارا دھواں کلا کے چہرے پر پھینک کر ہنس پڑا۔ بڑی عجیب سی کھسیانی ہنسی ، بڑی شکست خوردہ سی ہنسی ، بسورتی ہوئی ہنسی۔

” سچ بات ہے نا !“ کلا کی انگلیوں میں ابھی تک وہ تیز چاقو تھا جس کی دھار پر خود اس کا لہو چمک رہا تھا۔ اب اسی چاقو سے وہ سدھیر کو قتل کرنا چاہتی تھی۔

مگر سدھیر نے وہ تیز دھار والے چاقو کو موڑ کر چپکے سے کلا کی جیب میں ڈال دیا۔

” تم پگلی ہو ! میں کیا ڈھونڈوں گا ... جو کچھ مل رہا ہے ، وہ میری دونوں مٹھیوں میں نہیں سما رہا ہے۔ مجھے تو اپنے ہاتھوں سے گلہ ہے جو تمھاری دولت کو سمیٹ نہیں پا رہے ہیں !“

کلا نے فوراً ہی پلٹ کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ کچھ پڑھنا چاہا۔ اس کا سمندر جو دیر سے طغیانیوں کی زد میں تھا دفعتاً شانت ہو گیا۔ مگر لمحہ بھر بعد پھر ایک موج سی آٹھی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ” محبت کرنا اور کرتے رہنا کتنا کٹھن کام ہے ... کوئی میرے دل سے پوچھے۔ کوئی سدھیر کے دل سے پوچھے !“

کلا سچ کہتی ہے۔ کتنا مشکل کام ہے۔ محبت کرتے رہنا ، نبھاتے رہنا ، چلتے رہنا ، پھر مسکراتے رہنا۔ ایک مسلسل مسرت۔ ایک مسلسل اذیت۔ یہ دونوں جذبے ، ایسے آپس میں خلط ملط رہتے ہیں۔ ہر سانس تلوار بن کر آتی ہے اور پھول کی چھڑی بن کر جاتی ہے ...!

یہ جھوٹ تھا ، بالکل نرا جھوٹ تھا !

جب کلا سو گئی تو وہ اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا ۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ سلگتا رہا ۔ اس کے دل کے پاس ایک تیز خون آلود چھری جھولتی رہی ۔ آس پاس دھواں اٹھتا رہا ۔ اس کے لاشعور کی بند کھڑکی کی دراز سے تیز روشنی میں چمکتی ہوئی چھری چمک چمک جاتی اور اس کے کان میں کوئی آواز کہہ اٹھتی کہ یہ سب جھوٹ ہے ۔ اور سچ اگر کوئی چیز ہے تو وہ یہ کہ کلا اپنی ساری دولت دیتے ہوئے بھی چالاک اور بے ایمان بنیے کی طرح کوئی قیمتی ہیرا چرا لیتی ہے ۔ یہ کس لیے ؟

کس کے لیے ؟ شاید وقت کے نئے موڑ پر کوئی قرض خواہ اس کو مل جائے ، تو وہ کیا کرے گی ؟ شاید وہ یوں سوچ رہی ہے کہ اس کی یہ منزل نہیں ۔ وہ شجر سایہ دار نہیں ، جس کے نیچے بیٹھ کر وہ ساری عمر گزار سکتی ہے ۔ شاید اسے بھی احساس ہے کہ وقت کے مضبوط ہاتھ ہم دونوں کو الگ بھی کر سکتے ہیں ۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا ۔ بے چینیوں نے اس کی ہستی کو ہلا ڈالا ۔ وہ آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا ۔ ہلکی نیلی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی ۔ در و دیوار پر زہر کا رنگ بکھرا ہوا تھا اور اس زہر کے سمندر میں کلا سوئی پڑی تھی ۔

اس نے اضطرار سے بٹن دبا دیا ... روشنی ، تیز دودھیا روشنی ...

کلا کہاں کی شکل میں شفاف بستر پر لیٹی ہوئی تھی ۔ پنکھا چل رہا تھا ۔ اس کے گھنے سیاہ بال خاموش اور تاریک دریا کی طرح بکھرے پڑے تھے ۔ آنچل فرش کی خبر لے رہا تھا اور وہ گہری نیند میں یوں سوئی ہوئی تھی جیسے اس کو زندگی سے کچھ لینا تھا ، وہ سب مل گیا ہو اس کے چہرے پر غضب کا اطمینان تھا ۔

سدھیر مسکرا پڑا ۔ اس نے جھک کر اس کے چہرے پر انگلیاں پھیریں ۔ چہرے کی خوش رنگ چادر میں یہاں سے وہاں تک ہلکی سلوٹیں بیدار ہوئیں اور پھر ساکت ہو گئیں ۔ اس نے اس کے پتلے ، خوبصورت ، خنجر کی دھار کی طرح خوبصورت ہونٹوں پر انگلیاں پھیریں ۔

”اُنہہ ... چھوڑو ... سونے دو ...“ وہ کروٹ بدل گئی ۔

پھر وہ کلا کے اطمینان پر مسکرا پڑا ۔ اس نے سگریٹ سلگایا بتی بجھائی اور خاموشی سے ٹہل ٹہل کر کش لگاتا رہا ۔

مگر شاید یہ سچ نہیں ۔ کلا کچھ نہیں چھپاتی ۔ اپنی ساری کی ساری دولت اس پر سے نچھاور کر چکی ہے ۔ وہ خود غرض ... لالچی ہے ... بے ایمان ہے ... شاید محبت بذات خود لالچی اور خود غرض ہوتی ہے ۔ اسے جتنا کچھ دو ، وہ اور مانگتی ہے ۔ ایک چالاک پیشہ ور بھکاری کی طرح اس کا پیٹ بھرتا ہی نہیں ۔ جب ہی ، اس نے سوچا ، اس کے ذہن کی دنیا میں زلزلے کے جھٹکے پیدا ہوئے ، جب ہی کلا کو بھی کسی چیز کی تلاش رہتی ہے ۔ وہ بھی عین وقت پر اس سے کچھ مانگ بیٹھتی ، جو دراصل اس کے پاس ہے ہی نہیں ۔ تب وہ کیا دے ، اپنا سب کچھ دے دینے کے بعد بھی کلا کی تلاش کی نظریں بے بسی اور مایوسی سے اس کی طرف تاکتی ہیں تو وہ تڑپ اٹھتا ہے ۔ اس نے تو کچھ بھی نہیں چھپایا ۔ وہ کس کے لیے چھپائے گا ؟ لاکھ اس کی خاموش محبت نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ کنگال ہو چکا ہے ، مگر کلا مانتی ہی نہیں ۔ وہ بڑی محبت اور حسرت سے مانگ بیٹھتی ہے — " مجھے کچھ اور ... اور ... ! "

شاید جس طرح کلا کچھ نہ کچھ چھپا لیتی ہے ، خود اس کے اندر کا کوئی چالاک آدمی بھی کچھ رکھ لیتا ہے !

اس نے شام کو صاف لفظوں میں کہہ دیا — " ڈھونڈنے سے کچھ نہیں ملے گا ۔ تم مجھ میں اور میں تمھاری ذات میں جو کچھ تلاش کر رہا ہوں ، دراصل کلا اس کا وجود ہی نہیں ۔ تلاش کرنا بے کار ہے ... ! "

" نہیں تلاش کرنا بے کار نہیں ! " کلا نے بڑی گمبھیر ہو کر کہا تھا — " شاید یہی تلاش ہے ہماری الگ الگ ڈھونڈ ، جو ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر کیے جا رہی ہے ۔ یہی تلاش ، جو تمھیں میرے سمندر کی گہری سے گہری تہہ میں لیے پھرتی ہے ۔ ایک ایک مونگا ، ایک ایک موتی ، ایک ایک سیپ کو ٹٹولنے ، چھونے پر مجبور کیے ہوئے ہے ! "

" اور یہی جستجو ہے جو خود مجھے تمھاری ہستی کے سارے آسمان کی پرواز پر آمادہ کیے ہوئے ہے ! "

پھر کلا نے گھٹنوں پر سر رکھ کر گردن جھکا لی تھی ۔ اور بڑے چاؤ سے کہا تھا :

" اس جستجو کو جاری رہنے دو سدھیر ... شاید تمھیں ،

شاید خود مجھے ... وہ سب مل جائے !''

''مگر وہ سب کیا ہے...؟'' سدھیر ٹہلتے ٹہلتے زیرلب بڑبڑایا۔

'' شاید کچھ نہیں ۔ شاید وہم ... شاید ایک مسلسل لاحاصل تگ و دو ، نامکمل جستجو ، شاید تکمیل کی ہوس جو خود ادھوری رہتی ہے .... !

شاید ہوس کی تکمیل جو کبھی پوری نہیں ہوتی ۔ کبھی پوری نہیں ہوتی ، کبھی نہیں کلا ، شاید کبھی نہیں ؛ کیونکہ یہ پوری ہو جائے تو دنیا اتنی بدرنگ محسوس ہو کہ آدمی اس کی طرف پلٹ کر دیکھے بھی نہیں ، اس کی طرف تھوکے بھی نہیں ... تھوکے بھی نہیں !

اس نے پلٹ کر دیکھا کمرہ خاموش تھا ۔ کلا بے خبر سو رہی تھی ۔ سارے کمرے میں نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی ۔ ایک گھرے زھر کا رنگ ، ایک بے کراں زھر کا سمندر ، جس میں کلا اکیلی سوئی تھی ۔ اور وہ خود اپنے دل کی طرح بے قرار کمرے میں ٹہل رہا تھا ۔ کبھی اس کونے ، کبھی اُس کونے ... اس زھر کے سمندر میں ایک شکستہ کشتی کی طرح سوچ کی ہواؤں کے سہارے بھٹکا پھر رہا تھا ۔ کوئی سہارا نہیں ، کوئی ٹھکانا نہیں ۔ لمحہ بھر کو قرار نہیں ۔ دم لینا چاہے ، دم نہیں لے سکتا ۔ ڈوب جانا چاہے تو ڈوب نہیں سکتا ... کنارا کہاں ہے ، کنارا کہاں ہے ۔؟ شاید کنارا اس کے نصیب میں نہیں ۔ شاید ڈوب مرنا بھی اس کے مقدر کی بات نہیں ۔ ھر چند ہے ، نہیں ہے ۔

ہے ... نہیں ہے ۔ کیا ہے ، کیا نہیں ہے ۔ ھستی اور نیستی کے بیچوں بیچ ، جس بے نام سی شئے کی تلاش جاری ہے ، ایک فضول سی جستجو ، ایک لایعنی سی تلاش ، اس کے پاس ، کلا کے پاس ، کیا ہے ؟ کیا نہیں ہے ؟... زندگی کیا دے کر ، کیا چھپا گئی ہے ...؟

وہ بڑے سے دریچے کے سامنے کھڑا ہو گیا ۔ سامنے سمندر ، اندھیرے میں غرق تھا ۔ اوپر آسمان بھی اندھیرے کی ردا اوڑھے بے خبر پڑا تھا ۔ کہیں کہیں ستارے تھے جو ڈوبتے تھے ، ابھرتے تھے ، جاگتے تھے ، سوتے تھے ... پھر جاگتے تھے ....

کہیں کچھ نہیں تھا ۔ فضا چپ سادھے دم بخود تھی ۔ سناٹا ھر طرف ...

اُس کو دفعتاً وحشت سی ہوئی ۔ باہر کا سناٹا ، اندر کا سناٹا ...اس نے اندر کمرے کی طرف دیکھا ، دیواریں چپ تھیں ، دروازے، برسوں کے جاگے رہنے کے بعد ، آسودگی کی نیند سونے والے بے فکر انسان کی آنکھوں کی طرح بند تھے ۔ نیند ....!

نیلا ، گہرا ، زہر آلود کمرہ ...

کمرہ ، زہر کا خاموش سمندر بنا ہؤا تھا ۔ جہاں اکیلی ، پلنگ پر کلا سیب کی طرح پڑی ہوئی تھی ۔ زہر ... زہر ... زہر ... وہ جل گیا ۔ کلا کی آسودگی اس کے دل کو لگ گئی ... شاید کلا کو سب کچھ مل گیا ۔ سب کچھ ...

وہ جھوٹ بولتی ہے کہ اسے کچھ اور چاہیے ۔ اس کی التجا غلط ہے کہ جستجو جاری رہنے دی جائے ۔ زندگی نے اس کو اتنا کچھ دے دیا ہے کہ...

اس نے سگریٹ سلگایا ۔ اور آہستہ آہستہ کش لیتا ، خاموشی سے کمرے میں ٹہلنے لگا ۔ اس کا دل بے چینیوں اور بے قراریوں کے سخت فرش پر مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا ۔ اس نے آہستہ سے اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ لیا ۔

ایک ذرا آرام ملا تو آنکھوں میں آنسوؤں کا پردہ سا لہرایا...

اس نے ایک نظر کلا پر ڈالی ...کلا کی نیند ... گہری نیند... اس کے دل کو برما گئی ...!

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ، سگریٹ کی راکھ کی طرح بکھر گئی ۔

سدھیر نے ایک لمبی سانس لی ۔ اور آہستہ آہستہ چلتا ہؤا پھر کھڑکی پر بوجھ دے کر کھڑا ہو گیا ... اور گہرے تاریک سمندر کی سطح پر نظریں گاڑ دیں ...

پھر بہت دیر ہو گئی ۔ سمندر ، سمے کا سمندر کروٹیں لیتا لیتا بہت دور نکل گیا ۔ سوچتے سوچتے کنپٹیاں جلنے لگیں ...

”تم سوئے نہیں ؟“ دفعتاً اس کے کانوں نے کلا کی آواز سنی ”کیا سوچ رہے ہو ؟“

اس نے پلٹ کر دیکھا ۔ کلا جاگ اٹھی تھی ۔ کمرے میں نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی ۔ کلا کا دھندلا دھندلا وجود ... وہ اپنے لمبے بکھرے بکھرے بالوں کو سمیٹ رہی تھی ۔

اس نے کلا کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا ۔ خاموشی سے

گردن گھما کر پھر سمندر کی طرف یک ٹک دیکھنے لگا ۔
" میں پوچھ رہی ہوں ، اس طرح کیا سوچ رہے ہو ؟"
" سوچ رہا ہوں !" جیسے اس کے لاشعور سے آواز آئی ۔
" جس دن میں چلا تھا ، میرا انٹرویو تھا ، سرکاری ہسپتال تھا ۔ چھ سو روپے کی تنخواہ ...
" ہم نے اچھا نہیں کیا کلا !"
یہ کس کی آواز تھی ؟ سدھیر نے محسوس کیا ۔ اس کی اپنی آواز ہوتے ہوئے بھی اجنبی اجنبی سی ہے ۔ جیسے خود کلا ، اپنی ہوتے ہوئے بھی اجنبی اجنبی سی لگنے لگی ہے !
لیکن سدھیر کی آواز سن کر کلا چونک پڑی ۔ اسے لگا جیسے یہ آواز اس کی دیکھی بھالی جانی پہچانی ہو...!

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

نصیبے والی

واجدہ تبسم

نواب صاحب خط پڑھ کر بے حد خوش ہو رہے تھے۔

"...سلطان میاں حویلی والا مقدمہ ہار گئے۔ بی پاشا اپنے میاں پر جو پاندان کے خرچے کا دعویٰ دائر کرے تھے، وہ جیت آنھوں لیے۔ اس واسطے آج کل انوں بے حد خوش ہئیں — ہزار روپے مہینے کے حساب سے جوڑو تو سمجھو کی اب انوں اپنے میاں کی پوری جائیداد ہی ہتھیا لیے جیسا ہئیں — ہور میں آپ کو لکھی تھی کی نئیں (آجاڑ دماغ ہو مٹھی پڑ کو جاؤ یادچ نئیں رہتا کی پہلے خط میں کیا لکھی تھی کیا نئیں۔ اس واسطے کبھی ایک بات دو دفعہ لکھ دیا کروں تو آپ ہنسی نکو آڑایا کرو) کی مبارک بیگم کو آٹھ لڑکیوں کے بعد اب خداوند تعالیٰ لڑکا بھی عنایت فرما دئے۔ عقیقے کی دعوت ہم سوب کو بھی آئی تھی۔ میں ہاتھوں کو سونے کے کڑے دی۔ بس پوچھو نکو کتی ہنسی ہوئی۔ سوب بولنے لگے کی اب تو بیٹا ہؤا۔ اب تو تمے کم سے کم کڑے چوڑیاں مت دینا تھا۔ مگر میں بولی سونے کی ہتھکڑی خوش نصیباں ہی پہنتے۔ ایک مزے کی بات آپ کو بتانا بھولچ گئی۔ آٹھ بیٹیاں ہونے ہونے سے مبارک بیگم اب لڑکی کی خبر کے ایسے عادی ہوگئے تھے کی ٹیبل پر پڑے پڑے انوں ڈاکٹرنی سے پوچھتے بھی نئیں تھے کی میرے کو کیا ہؤا — خود ہی بول لیتے تھے "اونہہ لڑکیچ ہوئی ہوئیں گی" اسی مارے ابھی بھی نئیں پوچھے، پر جب ڈاکٹرنی خود اٹھا کو بتائی کی لڑکا ہؤا ہے تو انوں دو گھنٹہ کی زچہ آٹھ کو کھڑے ہو گئیں۔ پھر ڈاکٹرنی خود پکڑ کر لٹا دی..."

ایسا مزے کا خط تھا۔ اور یہ تیسری بار تھی کہ خدمت گار کھنکار کھنکار کر انہیں مخاطب کرنے کی جرأت کر چکا تھا۔ مگر وہ بری طرح خط میں الجھے ہوئے تھے۔ "... آپ کو شاید یہ بات پتا چلی کی نئیں کی ممانی اماں کی چھوٹی بیٹی کی نسبت طے ہوگئی۔ اللہ اپنے کو خود اتا نوازا کی کسی کا دیا لیا آنکھوں میں نئیں بھرتا۔ پر سمدھیانے والے پیروں میں سونے کے سوا سیر کے پازیباں لائے تو

یہاں سب پٹاپٹ دیدے مارنے لگے - میں تو ہلو اٹھ کو گرمی کے بہانے آنگن میں چلی گئی - اب یہ نکو پوچھو کی کیوں - ایک بات ہور لکھنے کی رہ گئی - میں ایسا سنی کہ بڑے چچا اپنی کنواری بیٹی کو ڈاکٹرنی بنانے کے واسطے حیدرآباد بھیج دئے - کیسا خراب زمانہ آگیا مولیٰ - اب ذرا سوچو آنے کنواری چھو کری کتے برے برے باتاں شادی سے پہلے اچ دیکھ لیں گی - خیر اپنے کو کیا - ہور تو گاؤں میں سب خدا کا فضل ہے - کتے فصلاں اب کی خوب بہار پو ہیں - خاص طور سے چاول بھین دھان تو خوب پھلا ہے - میں تو بھوت دناں ہوئے ڈیوڑھی سے باہر خدم بھی نئیں نکالی - گٹھیا کے مارے جان عذاب میں ہے آجاڑ - آپ کیسے ہئیں لکھنا - ہور یہ بھی لکھنا کی آپ کو میرایہ ''روزنامہ اخبار'' پسند آیا کی نئیں -

آپ کی تابع دار —— بیگم صاحبہ

یہ بڑے مزے کی بات تھی کہ تابع دار لکھنے کے باوجود ، بڑی نوابن ہمیشہ خود کو بیگم صاحبہ لکھتیں - نواب صاحب اپنی ان بیگم کی تحریر کے دیوانے تھے ، ھنسی سے ان کے خط کو ''اخبار'' کہا کرتے کہ دنیا جہان ، بھرے خاندان کی خبریں ان کے ایک خط سے مل جاتی ہیں - وہ بے چاری کوئی ایسی بوڑھی نہیں ہوئی تھیں ، یہی پینتیس ، چالیس کے پیٹے میں تھیں ، لیکن گٹھیا نے مار رکھا تھا - انھوں نے اپنی بیماری کی وجہ سے گاؤں آباد کر لیا تھا اور نواب صاحب کو کھلی چھٹی دے گئی تھیں - ساتویں تک تعلیم پائی تھی - اس تعلیم کا بدلہ اب یوں چکا رھی تھیں کہ مار خط پہ خط بورے خاندان میں دوڑائے جاتیں - نواب صاحب تو کہتے کہ شراب کا نشہ ایک طرف اور بڑی بیگم کے خطوں کا سرور ایک طرف - جب بھی گاؤں سے ان کا خط آتا وہ بار بار پڑھتے اور لطف اٹھاتے — مگر آج ... کم بخت پھر کھنکارا —

انھوں نے سر گھما کر غصے سے دیکھا اور کہا : '' یہ کیا نامعقولیت ہے ؟'' مگر گردن گھماتے ھی جیسے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں - یہ لمبی قطار سوکھے مارے قحط زدہ ، لٹے پٹے کسانوں کی ... خیر قطار کو مارو گولی - قطار کے کونے پر کوئی اٹھارہ سال کی جوان اور بھرپور فصل لہلہا رھی تھی - سچ مچ کے گیہوں کا سا چمکتا رنگ ، نئی کوری صراحی کی طرح سنسناتا بدن کہ جس پر پانی کا پہلا چھینٹا گرے تو سن سن بولنے لگے - کمر ایسی

کہ کروٹ سے لیٹے تو جسم میں ایسا گڑھا بیچ میں پڑ جائے جیسے اس میں چوڑی بھی ڈھیلی خلخل ہو جائے گی ۔ اور کم بخت کے بال — ساری زندگی حیدر آباد میں گزری ۔ عمر بھر دیکھتے رہے یہ مامائیں اصیلیں ، خواصیں ، کنیزیں ۔ چاول کے ساتھ املی کا کھٹا ”کٹ“ کھا کر عمر گزارنے والی مخلوق ۔ کٹ پکاتے سمے جو املی کے پھوک بچ رہے اسی میں گیہوں کا تھوڑا آٹا ملا کر لئی جیسی ”انکل“ بنا لی اور سر میں تھوپ کر نہا کر اٹھ کھڑی ہوئیں ۔ یہی ان کا شیمپو ٹھیرا ۔ اور اسی نامراد شیمپو سے کیا جھکا جھول بال بڑھتے تھے ، مگر یہ بھی تو انہی میں کی ایک نظر آ رہی تھی اور اس کا شیمپو بھی یہی املی کے پھوک کا ”انکل“ رہا ہو گا ۔ لیکن یہ بال تھے کہ چڑھتی ندی ۔ ماتھے سے شروع ہوئی تو سیدھی ایڑیوں تک جا اتری ۔ تیل سے بیگانہ ، الجھے ہوئے خاک دھول میں اٹے — مگر اف ! اف ! سرد موسم کے باوجود انہیں اس قدر شدید گرمی لگنے لگی ۔ وہ ”پنکھا — پنکھا“ چلا اٹھے ۔ خدمت گار نے ہڑبڑا کر فرشی جھالر دار پنکھے کی زرکار ڈور تھام لی ۔ دھیرے دھیرے ان کے حواس واپس آنے شروع ہوئے ۔ حوصلہ پا کر خدمت گار نے عرض کی : ”حضور کی خدمت میں مختار صاحب حاضر ہونے کو پوچھ رئیں —“

مختار عام اپنی سنہری کلاہ سر پر جماتے ہوئے برآمد ہوئے اور بے حد شائستگی سے ، آواز کو اس قدر سریلا بنا کر کہ زخموں کی سی ڈھب آ گئی ، سر جھکائے جھکائے بولے : ”ہر سال کی طرح اس سال بھی ویگن بھر کر قحط زدہ کاشتکار حضور کے در پر مالی امداد کے بھروسے آئے ہیں —“

نواب صاحب نے ذرا کی ذرا سر اٹھا کر نگاہ ملا کر دیکھا ، منہ سے کچھ بولے نہیں ، مطلب یہ تھا کہ بیان جاری رہے ، اور بیان جاری رہا : ”ان میں سے چند ایک تو حضور کے دولت کدے پر سال بھر غلامی کے عوض صرف پیٹ بھر کھانے اور تن بھر کپڑے کے طلب گار ہئیں اور چند...“

”اور چند ؟“ نواب صاحب نے اچانک بات کاٹ دی ۔

”اور چند زمینات چاہتے ہیں — بہت ہلکی شرائط پر ۔“

تنی ہوئی گردن ایک ”ہُم“ کے ساتھ ذرا نیچے جھک گئی ۔ تین بار چٹکی بجی اور مطلع صاف ہوگیا — اب وہاں صرف مختار عام

رہ گئے تھے ، جو شائستگی کی حدود کو اس قدر شدت سے پہنچ چکے تھے کہ دوھرے ہو کر رہ گئے تھے -

" زمینات مانگنے والوں کو زمینات دے دیجیے -"

" بہتر -"

" اور حضت ایک بات بتائیے -"

" جی سرکار -"

" سال بھر غلامی کرنے والوں میں عورتاں زیادہ ہئیں یا مرد ؟"

" جی حضور ، عورتیں تعداد میں بڑھ کر ہیں -" مختار عام نفیس لکھنوی لہجے میں فرما رہے تھے : " لیکن چند خواتین اپنے اپنے شوھروں کے ساتھ ھیں -"

ایک لمحے کے توقف کے بعد نواب صاحب نے پوچھا : " اور وہ جو کوری صراحی کی طرح سنسنا رہی تھی ، کیا وہ اپنے کمہار کے ساتھ آئی ہے ؟" لیکن یہ جملہ مختار عام نے نہیں سنا کیوں کہ دراصل یہ جملہ حضور کے صرف ذھن نے سوچا تھا - زبان سے ادا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا ، اس لیے اونچی آواز سے انھوں نے یہ پوچھا : " اور وہ گندی سی چھوکری جس کے لٹوریاں اس کے ایڑیوں کو چھو رہے ھیں ، آئے ؟"

مختار عام لجلجے لہجے میں گھگھیائے : "حضور خادم کو ابھی اتنی تفصیل نہیں معلوم ہے - اجازت ہو تو یہاں بلوا لوں ؟"

تھوڑی دیر میں بھاری پردہ ہٹا اور بجلی سی لہرا کر رہ گئی - پھر ایک پیلے سوکھے مارے چوبیس پچیس سال کے مرد نے ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا اور دھرا ہو کر سلام کیا - لڑکی کھس کھس کر کے ھنسنے لگی - مرد نے دھیرے سے اسے ڈانٹ کر پوچھا : " تو نے سلام کری گے ؟"

وہ بے باکی سے بولی : " مئیں کانے کو کروں ؟ کیا میرے کو انام ملا کی جھک جھک کو سلام ٹھونکوں ؟"

" چپ کے چپ !"

مرد ڈر کے مارے ساری جان سے پیلا پڑ گیا - مگر نواب صاحب کو یہ شوخی لے ڈوبی - مسکرا کر بولے : " انعام بھی مل جائے گا -" اور جیسے آنکھوں ھی آنکھوں میں انھوں نے اسے کھا ڈالا -

تفصیل سن کر نواب صاحب کو پتا چلا کہ دھان کی فصل کی

کٹائی کے بعد روز مزدوری کرنے والوں کی " کھیپ کی کھیپ "
جو ہر سال بے کار ہو کر اضلاع سے حیدر آباد دکن کا رخ کرتی
ہے ، ان ہی میں یہ جوڑا بھی آیا ہے ۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہے
جو نصیبوں سے فصل اچھی ہو یا بری ، سدا قحط زدوں میں ہی
شمار ہوتے ہیں ۔ ساون ہرے نہ بھادوں سو کھے ۔

مرد اب اس بات کا طلب گار تھا کہ چھوٹی موٹی زمین کا ایک
ٹکڑا اسے گاؤں میں نواب بدر یار جنگ کی جاگیر سے عطا کر دیا
جائے اور چوں کہ زیور گہنا رہن رکھنے کے لیے کچھ پاس ہے نہیں
اس لیے زمین کے عوض سال بھر کے لیے اس کی جورو کو غلامی
میں لے لیا جائے یعنی محل میں اس سے جھاڑو لگوائی جائے ، یا پودوں
میں پانی ڈلوایا جائے ۔ یا چاول کٹوائے جائیں یا مرچ مسالہ پسوایا
جائے ۔ سال بھر کی آمدنی سے پھر وہ نئے سرے سے اپنی زندگی شروع
کرے گا ۔

نواب صاحب نے ذرا اچنبھے سے پوچھا : " میاں خالی زمین
کا ٹکڑا لے کر تم چاٹیں گے کیا ؟"

"جی نئیں حضور ۔" وہ ہاتھ ملتا ہوا بولا : " میں ترکاریاں
بو لیوں گا ۔ حضور کو شاید معلوم نئیں کی بھنڈی کی فصل بہت جلدی
جلدی آترتی ۔"

" ایک شکل یہ بھی ہو سکتی نا کی تم دونوں مرد جورو
ادھرچ کوئی کام کر لیو ۔"

وہ معذرت کے لہجے میں بولا : " نئیں حضور مرد آدمی ہوں ۔
کبھی ایسا گھردار کا کام میں نئیں کرا ، کی روٹیاں تھوپ لیتا بیٹھا
یا مرچی کوٹ لیتا بیٹھا ۔ میرے کو تو سرکار باہر کے کام اچ اچھے
لگتے ۔ ہور سرکار اصل بات یہ کی عمر بھر سے کھیتوں میں کام کرنے
کی عادت پڑی وی ہے ۔"

بیچ میں وہ پٹاخہ بول پڑی : "مرد ذات گھر کے اندر کا مان
کریں گا تو کیسا لگیں گا ؟" اور ساتھ ہی کھس کھس کر کے زور
زور سے ہنسنے بھی لگی ۔ " سرکار مردوے تو دھڑم دھس کامان
کرتے اچ بھلے لگتے ۔" اور اس نے بڑے غرور اور پیار کے ساتھ اپنے
مرد کی طرف دیکھا ۔ اچانک اس کے لہجے میں غم سمٹ آیا ۔ " ابھی
تھوڑے دناں پہلے دیکھتے سرکار اس کو ۔ ایسا موٹا کٹا تھا کی پوچھو
نکو ۔ شیر چیتا ڈر کو پیچھے ہٹ جاتا ، پن انے نئیں ہٹتا ۔ اب کھانے

کو نئیں تو کیسا سوکا پڑ گیا ۔''

مرد کے کاٹو تو بدن میں شاید ھی دو چار قطرے خون نکل پاتے ۔ جو محفلوں ، اونچی جگہوں پر جانے آنے کا ذرا عادی ہو وہ تہذیب آداب سے بھی کچھ واقف ھو ۔ وہ تو کئی بار بڑی بڑی ڈیوڑھیوں حویلیوں میں ہو آیا تھا ، اسی لیے اسے پتا تھا کہ صدر دروازے سے داخل ہوئے بعد آنکھوں کا کام صرف زمین کو دیکھتے رہنا ہے ۔ اس کم بخت نے کبھی ایسی جگہ قدم رکھا ھی نہیں تو جانتی بھی کیسے کہ بڑے لوگوں سے بات کرنے کے بھی چند آداب ہوتے ھیں ، یہ نہیں کہ اپنے ساتھ کام کرنے والیوں کی طرح نواب حضور کو سمجھ لیا اور لگی ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے ۔ مگر اس وقت تو اس کی اتنی ھمت بھی نہیں ھو پا رھی تھی کہ اسے ٹوک ھی دیتا لیکن اس کے خدشوں کے برخلاف نواب صاحب اس پٹاخہ کی باتوں سے بے حد محظوظ ھو رہے تھے ۔

'' سرکار آپ ھمنا اتنا بڑا زمین کا ٹکڑا دیو کی ھمارے سارے دلدراں دور ھو جانا ۔ آجاڑ دو برساں شادی کو ہوئے ایک سکھ میں نئیں دیکھی ۔'' پھر ایک ھاتھ سے اپنے گھور گھنگور بال جھلا کر جھلاہٹ سے بولی : ''مہینہ بھر بھر تو سرکو تیل نصیب نئیں ہوتا ۔''

اب کی مرد بھی تاؤ کھا گیا ۔ '' پاؤ بھر تیل تو ایک دفعے میں اس کے سر کو ھونا سرکار ۔ اتی دفعے بولا کی اتے لمبے بالاں رکھ کو کیا کرتی کاٹ ڈال ، سنتی بھی تو نئیں ۔''

وہ ناک چڑھا کر بولی : '' عورت کو پالنے جتا حوصلہ نئیں تھا تو شادی کائے کو کیا رے کنجڑے ؟'' اور ایک دم ھنس پڑی ۔ مرد بھی ھنسنے لگا ۔ نواب صاحب کے لیے یہ سب کچھ بڑا انوکھا ، بڑا عجیب ، بڑا حسین سا تجربہ تھا ۔ ان کی ساری زندگی بری طرح مصروفیات کا شکار تھی ۔ زمینیں ، کورٹ کچہری ، مقدمے ، اپنے برابوں کے جھگڑے ۔ دوسری طرف دعوتیں ، پارٹیاں ، خاطر مدارات ، رت جگے ، رات گئے تک مجرے ، طوائفیں ، ناچ گانے ۔ بڑی بیگم گاؤں بسائے بیٹھی تھیں ۔ اس کے بعد دو تین شادیاں منہ کا مزہ بدلنے کو کیں ، جو اچھی شکل نظر میں بھری اسے داشتہ رکھ لیا ۔ سارا ''حرم'' پٹا پڑا تھا ۔ یہ پیار محبت ، یہ نوک جھونک ، جو ازل سے ابد تک کے لیے خدا نے مرد عورت کو خوش ہو کر ودیعت کی ہو گی اس کا ان کی زندگی میں دور دور پتا نہ تھا ۔ ایک عجیب و غریب خواھش

نے ان کے سینے میں سر ابھارا : '' اس تن تناتی ہوئی جوانی کی نوک جھونک کا شکار اگر میں ہو جاؤں تو ؟''

'' تم اپنا نام نہیں بتائے اب تک ۔'' انہوں نے لڑکی سے اچانک سوال کر ڈالا ۔

'' چھجو ۔'' وہ بڑے فخر سے بولی ۔

'' چھجو ؟'' نواب صاحب حیرت سے بولے : '' یہ کوئی نام ہؤا بھئی ؟''

مرد حوصلہ پا کر بولا : ''سرکار اس کا نام تو شہزادی ہے ۔ سوب لوگاں پیار سے بگاڑ کر چھجو کر دے ۔''

'' سوب نئیں ایکلا (اکیلا) تو اچ بگاڑا ۔'' وہ پھر لڑائی مول لینے پر تل گئی ۔

مرد کے چہرے پر وہ پیار بھری خجالت چھا گئی جو صرف ایک مرد کو ہی جچتی ہے ۔ جیسے زیر ہو کر بولا : '' سرکار آپ اس کی باتاں پو کان نکو دیو ۔''

(کان میں دینا بھی نہیں چاہتا ، کیونکہ میں دل دے چکا ہوں ۔)

نواب صاحب نے ہڑبڑا کر مختار عام سے کہا : '' دلشاد پور کی نہری پانی والی زمین کا وہ بڑا کھیت ، کیا نام ہے میاں تمہارا ؟''

'' جی سرکار ــ عزیز ۔''

'' ہاں ، انوں عزیز میاں کو دلوا دیو ۔ بیج وغیرہ کے واسطے اوپر سے سو روپے بھی دلوا دیو ۔''

عزیز بے ہوش ہوتے ہوتے بچا ، لیکن اگر اسے پتا ہوتا کہ نواب بدر یار جنگ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ، اگر وہ جانتا کہ ان کے پرکھوں نے کبھی کسی سائل کو سفید دھات یعنی چاندی تک خیرات میں نہ دی ، جب دیا سونے کا سکہ ہی دیا تو شاید اسے اتنی حیرت نہ ہوتی ۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی جتنے دیہاتی گاؤں اور اضلاع سے آئے تھے ڈیوڑھی میں کھپ گئے ۔ ان میں مرد بھی تھے ، عورتیں بھی ، بچے بھی ۔ مردوں میں سے کوئی خانساماں کی مدد کو لگ گیا ، کوئی مالی بن گیا ، کوئی دربان کے ساتھ لگ گیا ، کسی نے جھاڑ فانوس کی صفائی اپنا لی ۔ جتنی بڑی ڈیوڑھی اتنے ہی پھیلے ہوئے کام ۔ عورتوں میں سے کچھ پاشا لوگوں اور صاحبزادیوں کے ذاتی کاموں پر لگائی گئیں ۔ چند باورچی خانوں میں مسالے، مرچ ، سبزی ترکاری بنانے پر جٹ گئیں ۔ کوئی نواب صاحب

کا حقہ بھرنے پر ، کوئی ان کے پیر دبانے پر ، کوئی انہیں جگانے پر ، کوئی سلانے پر مامور ہوئی ۔ جاموں کی طرح سب کی سب گردش میں آ گئیں ۔

لیکن شہزادی نہ تو ساقی بنی نہ جام ۔ نواب صاحب نے زنان خانے میں حکم بھجوا دیا تھا کہ شہزادی عرف چھجو نام کی ایک لڑکی کو کسی سے متعلق نہ کیا جائے ۔ وہ کھاتی پیتی ، مزے میں دندناتی ساری ڈیوڑھی میں ہرنی بنی پھرتی ۔

سر سر کرتے اتنے سارے دن نکل گئے ۔ نواب صاحب کن حالوں کو پہنچ گئے ، کسی کو اس کی خبر نہ تھی ۔ بڑی نوابن کے لمبے لمبے اخبار نما خط آتے پڑے سڑتے رہتے ، وہ انہیں چھو کر بھی نہ دیکھتے ۔ مجرے ، رت جگے ، ناچ گانوں کی محفلیں جیسے سب ساتھ چھوڑ گئیں ۔ بس جان بوجھ کر خود کو کاموں میں غرق کیے رہتے ۔ زنانے میں بھی کم ہی جاتے ۔ اتنے دن بعد ایک بار کسی کام سے گئے ۔ بیچ کا دروازہ اندر سے بند تھا اس لیے نوکر خانے سے ہوتے ہوئے گئے ۔ سامنے ''پرچھتی'' میں شہزادی کھڑی نہا کر بال سکھا رہی تھی ۔ انہیں ایسا لگا کہ ان کی آنکھوں کی بینائی زائل ہو جائے گی ۔ جسم سچ مچ کانچ بن کر جھل جھلا رہا تھا کم بخت کا ۔ بالوں میں وہ سیاہی پیدا ہو گئی تھی کہ ان کے اپنے نصیب کی سیاہی بھی ماند تھی ۔ پیٹ بھر کھانا ، کام نہ فکر ، کھلی ہوا ، وہ روپ نکھرا تھا کہ تنا ہوا گوشت آپ ہی آپ تڑتڑ بول رہا تھا ۔ وہ جیسے بغیر کسی بندش کے خود کو آزمانے جا رہے تھے ۔ '' ابھی نہیں ، ابھی نہیں ۔''

چھٹے مہینے عزیز آیا ۔ کوئی دیکھتا تو پہچان نہ پاتا کہ یہ وہی چھ ماہ پہلے کا سوکھا مارا سڑیل چوزہ ہے ، جو اب یوں اصیل مرغ کی طرح سینے کو تانے اکڑا اکڑا پھرتا ہے ۔ وہ اور چھجو دونوں آزاد پرندوں کی طرح چونچ میں چونچ ڈالے اس حوض کی منڈیر پر بیٹھے چہلیں کر رہے تھے جو نواب صاحب کی خواب گاہ کے نیچے والے باغ میں تھا ۔

'' تو کتا خوبصورت ہو گیا رے ۔'' چھجو بے حد بے تکلفی سے بولی ۔

'' ہور تو تو سونے چاندی کے جیسی جھل جھلا رئی ۔ ہاتھ لگانے کو ڈر لگ را کی میلی ہو جائیں گی ۔''

وہ انگوٹھا دکھا کر ھنسی : ''ھور جیسا میں تیرے کو ھاتھ لگانے ای تو دیوں گی نا ۔'' اور وہ اٹھ کر بھاگنے لگی ۔

عزیز نے اسے لپک کر گود میں بھر لیا : '' ارے تیرا مرد ہوں کتی ...''

اور یہ سب نواب صاحب نے کھڑکی میں سے دیکھا — مرد ، مرد ، مرد ۔

جس پھل کے پکنے کا وہ خود انتظار کر رہے تھے ، ایسا پک جائے اتنا پک جائے کہ ٹپ سے جھولی میں آ گرے ۔ ہاں وہ یہ کیسے بھول گئے تھے کہ یہ پھل کسی اور کی جھولی میں بھی گر سکتا ھے ۔

'' مروا دیں ؟'' مزہ نہیں ۔

'' زہر کھلوا دیں ؟'' یہ کوئی کارنامہ نہ ھوا ۔

''کہیں پھنکوا دیں ؟'' کوئی نئی بات نہیں ۔

پھر ؟ مرد ، مرد ۔ اس مرد کو کیا کریں ؟

ایک خوف ناک منصوبہ ان کے ذھن میں ابھرا ۔ تالی بجا کر خدمت گار کو بلایا ۔ خدمت گار مختار عام کو بلا لایا ۔ مختار عام کو حکم ھؤا : '' جراح کو بلوائیے ۔''

جراح آ گیا تو پوچھا : ''کبھی کسی بکرے کو آپ کسی بکری کے ناقابل کیے ھئیں ؟''

جراح تیور دیکھ کر سب کچھ سمجھ گیا ۔ ھاتھ جوڑ کر بولا :

'' حضور ، ساری عمر اسی میں گزاری ھے ۔''

'' مگر اتنا یاد رکھو کی جان نہ جانے پائے ۔''

'' بہت بہتر حضور ۔''

مختار عام کو کھڑکی کے پاس بلوا کر عزیز کا چہرہ دکھایا اور تاکید کی : '' سب کاماں پہرے میں کرنا ۔'' جراح الٹے پیر سر جھکائے جھکائے واپس ھو گیا ۔

تین ھفتے بعد نواب صاحب بہ نفس نفیس نوکر خانے میں تشریف لے گئے ، عزیز کے '' غسل صحت '' کا حکم صادر فرمایا ، بڑی مغلانی کو بلوا کر ھدایت کی کہ ایک کمرہ چنبیلی ، موگرہ ، موتیا ، گلاب اور خوشبوؤں سے بسا دیا جائے ۔ کچے اگر اور لوبان کے پیالے بھر بھر جلائے جائیں ، شہزادی کے لیے سرخ رنگ کا کام دار جوڑا تیار کرایا جائے اور اسے دلہنوں کا سا روپ سنگھار دینے کے

بعد عزیز کو ایک دلہا کی طرح اس کے کمرے میں پہنچا دیا جائے ۔
ہر کام حسبِ حکم عالی انجام دیا گیا ۔ لیکن دوسری صبح کمرے کا دروازہ جب باہر والوں نے پیٹ پیٹ کر توڑ کر کھولا تو عزیز سرخ کام‌دار دوپٹے کو گلے میں باندھے چھت سے لٹکا ہؤا تھا ۔ اور دلہن بنی شہزادی بے ہوش پڑی ہوئی تھی ۔
ابھی نہیں ، ابھی نہیں ۔ دراصل وقت ابھی تک نہیں آیا تھا ۔ ہر کام مذہب اور شریعت کی رو سے ہونا چاہیے۔ اس لیے عدت کی مدت ختم ہونے کا مزید انتظار کیا جائے ۔ ایک نہ دو پورے تین ماہ دس دن ۔ یعنی لگ بھگ کوئی چار مہینے ۔ آخر خدا کو بھی تو منہ دکھانا ہے ۔

چوتھے مہینے کے خاتمے پر —
ساری ڈیوڑھی میں نئے سرے سے قلعی کرائی گئی ۔ ملازموں کی نئی پوشاکیں بنیں ، خواصوں ، ماماؤں ، کنیزوں کو ایک ایک نئے جوڑے کے ساتھ ایک ایک تولہ سونے کا زیور انعام میں دیا گیا ۔ پوری ڈیوڑھی میں چراغاں کیا گیا ۔ قالین ، پردے ، فرنیچر بدلے گئے ۔ نواب صاحب کا کمرہ جگ مگ کرنے لگا ۔ دروازوں پر سانچے موتیوں کی لڑیوں کے پردے لٹکائے گئے۔ چھتوں پر جگر مگر کم خواب کی چھت گیریاں ٹانکی گئیں ۔ ایسے قالین فرش پر بچھائے گئے کہ پاؤں گھٹنوں تک دھنس جائیں ۔ مالیوں اور پھلاریوں کو حکم ہؤا ایسے سہرے اور بدھیاں گوندھیں کہ سارا حیدرآباد خوشبو سے مہک مہک اٹھے ۔ باورچیوں کو دعوت عام کے لیے منہ مانگی جنس دی گئی ۔ ہزاروں سیر اصلی گھی ، بریانی ، متنجن ، پلاؤ ، مٹھیوں میں انڈیلا جانے لگا ۔ ڈیوڑھی کے کنوؤں میں کئی سو تھیلے شکر ڈالی گئی کہ پانی شربت کی طرح میٹھا ہو جائے اور لوگ پانی کی بجائے شربت پی پی کر دعائیں دیں ۔ اور یہ سب اس لیے ہو رہا تھا کہ نواب صاحب ایک کو اپنانے جا رہے تھے ۔ یہ ساری تیاریاں اور ہنگامے اور چونچلے ، اس لیے تھے کہ نواب صاحب کو آج تک زندگی میں کوئی شکل اس شدت سے نہیں بھائی تھی ۔
ادھر ڈیوڑھی کے زنان خانے میں کئی کئی مغلانیاں بیک وقت ایک شہزادی پر جتی ہوئی تھیں ۔ خالص شمامۃ العنبر ، حنا اور گلاب کے عطر سے اس کے بدن کی مالش ہو رہی تھی ۔ لمبے لمبے بالوں کو

مٹی کی سوراخ والی ھنڈیا میں لوبان اور عود سے چٹختے انگاروں کے دھوئیں میں بسایا جا رہا تھا - شہزادی کے لیے جو جوڑا سلا تھا اس میں سچے یاقوت ٹانکے گئے تھے اور مانگ میں بھرنے کے لیے جو افشاں بنائی گئی تھی وہ تولہ بھر سچے ھیروں کو پیس کر تیار کی گئی تھی -

رات چڑھی تو پیاس بھی بڑھی - پھر کوئی رات کے دس گیارہ بجے ، نواب صاحب بغیر نکاح ، بغیر گواھوں ، بغیر وکیل ، بغیر مہر ، بغیر کسی پابندی کے دلہن کی خواب گاہ میں داخل ھو گئے کہ اس خداوند تعالیٰ نے جس نے یہ دنیا ، یہ مرد و زن بنائے ھیں ، اسی نے صاحب حیثیت مردوں پر باندیاں اور لونڈیاں بھی حلال کر دی ھیں -

اندر صحن میں اصلی گھی سے ترتراتی بریانی کھاتے ہوئے مالن تمبولن سے بولی :

” اجاڑ ماری کیا نصیبے والی ھے ، سچ مچ شہزادی بن گئی -“

☆ ☆ ☆

اپنا سا منہ

عفرا بخاری

دونوں نے ایک خاص منصوبے کے تحت زندگی کا آغاز کیا تھا - جب وہ پہلی بار ملے تو دونوں نے فوراً ایک دوسرے کی ضرورت کو محسوس کر لیا - نفیسہ کو ایک ایسے وجیہہ اور سمارٹ خاوند کی ضرورت تھی جو متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنی ظاہری وضع قطع سے اونچے طبقے کا فرد دکھائی دے — اور جمیل نے بھی سوچا تھا نفیسہ اس کے آئیڈیل پر پوری آترتی ہے - اسے ایک ایسی ہی عورت کی ضرورت تھی - دونوں ایک آزاد ، آرام دہ اور بے فکر زندگی کے متمنی تھے -

شادی کے وقت نفیسہ سوشیالوجی میں ایم - اے کرنے کے بعد نئی نئی ملازم ہوئی تھی اور جمیل کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ دیکھا جائے تو نفیسہ سے شادی کا اصل محرک یہی تھا ، کیونکہ عورت کا ملازمت کرنا فیشن بن چکا ہے اور جمیل اس بات پر خوش تھا - صبح دونوں اکٹھے ناشتہ کر کے دفتر چلے جاتے - شام کا کھانا بھی اکٹھے کھاتے - گھومنے پھرنے کا پروگرام بھی اکٹھے بناتے - دعوتیں کھانے کھلانے کے بھی شوقین تھے- پہننے کو نت نیا لباس ، رہنے کو ایک خوبصورت گھر اور سواری کے لیے سکوٹر رفتہ رفتہ انہیں یہ ساری سہولتیں حاصل ہو گئی تھیں -

نفیسہ کو گھرداری سے کوئی دلچسپی نہ تھی - گھر بیٹھنا اس کے لیے دوبھر تھا - چھٹی کا دن بھی عموماً وہ کسی پروگرام کے تحت باہر گزارتے -

گھر کی دیکھ بھال انہوں نے خالہ معین کے سپرد کر دی تھی — خالہ معین بیوہ اور بے اولاد تھیں اور اپنی کم سخنی اور لیے دیے رہنے کی عادت کے سبب خاندان بھر میں مشہور تھیں - اس لحاظ سے انہوں نے ایک نہایت موزوں عورت کا انتخاب کیا تھا - خالہ معین نے ان کے کسی معاملے میں دخل انداز ہونے کی کبھی کوشش نہ کی تھی بلکہ ان پانچ سالوں میں اس نے ان سے چند مخصوص جملوں کے علاوہ کوئی دوسری بات نہ کی تھی - نفیسہ خالہ سے بطور خاص

خوش تھی -

کبھی کبھار خالہ ناشتے کی میز پر پوچھ بیٹھتی :

" بیٹی آج کیا پکا لیا جائے ؟ " تو نفیسہ کے کانوں کو یہ الفاظ اجنبی لگتے - وہ ایک ایسی بے تعلقی سے جس میں بناوٹ کی جھلک ہوتی جواب دیتی :

" خالہ ، بس یہ نہ پوچھا کرو - گھرداری میں مجھے صفر جانو - "

اور جمیل اس کے جواب سے خوش ہو کر کہتا :

" ہاں ، خالہ ، ہم یہ سب کیا جانیں - ان معاملوں سے تم خود ہی نپٹ لیا کرو - "

اور خالہ معین مزید کچھ کہے بغیر کواڑ کے پیچھے اپنا سفید سر لیے غائب ہو جاتی -

مگر یہی نفیسہ دفتر کے کمرے میں اس بے تعلقی کا کبھی اظہار نہ کرتی جب مسز وحید وزٹ پر آتی اور وہ ہاتھ چلا کر تنبیہہ کہتی : " ٹارگٹ سے اتنا لو شو کر رہی ہو ! یاد رکھنا سالانہ ترقی پر اثر پڑے گا - " تو یہ الفاظ اسے ہرگز غیر مانوس نہ لگتے -

وہ کرسی میں دھنسی ان الفاظ کو بغور سنتی اور مسکرا کر کہتی : " مسز وحید ، واسطہ جاہل طبقے سے ہے - اتنی کنونسنگ پر بھی کیس نہیں ملتے - کیا کریں ، عورتیں عجیب و غریب افواہیں اڑا کر ہراس پھیلا دیتی ہیں - وہ جو ایک دو کیس بگڑ گئے تھے ان کا بڑا چرچا ہو رہا ہے اور وہ ــ "

" بس بس ، مسز جمیل ، کاغذی کاروائیوں میں یہ قصے کہانیاں نہیں لکھی جا سکتیں - اگر نوکری عزیز ہے تو ہمیں کیس شو کرنے ہوں گے - سمجھیں ؟ "

" سمجھ گئی - میں پوری کوشش کروں گی - پھر بھی کوئی کمی رہ گئی تو میرا کیس شو کر دیجیے گا - دیکھ لیجیے پانچ سال سے کیسی منصوبہ بندی کر رکھی ہے - "

" ہاں ، شاباش ! " مسز وحید قدرے کھسیانے پن سے کہتیں کیونکہ ان کے اپنے آٹھ بچے ہو چکے تھے -

مسز وحید کو مزید مرعوب کرنے کے لیے وہ بھاگاں کو آواز دیتی : " بھاگاں ، کل عورتوں کو نو بجے اکٹھا کرنا ہے سن لیا - "

" جی ، باجی جان " بھاگاں جواب دیتی -

" ہاں اور یاد بھی رہے - نہیں تو ابھی کان کھینچ دوں ؟ "

" یاد رہے گا جی ۔" بھاگاں مسکرا کر جواب دیتی ۔ اس دن گھر جا کر وہ جمیل سے یہ ضرور کہتی :

" آج رات سر پر بادام روغن کی مالش کروں گی اور صبح جلد اٹھا دینا ۔"

" کیوں ؟" جمیل انجان بن کر پوچھتا ۔

" صبح جاہل عورتوں سے مغز پچی کرنا ہے ۔"

" اوہو ! اچھا ۔ تو پھر یہ سعادت مجھے نصیب ہو جائے ۔"

اور رات کو وہ اپنے لمبے سیاہ بال کھول دیتی جنھیں جمیل بڑی محبت سے سہلاتا ۔

صبح وہ جلد بیدار ہوتی اور بڑی مستعدی سے خاص بناؤ کیے دفتر پہنچ جاتی ۔ نو بجنے سے ذرا پہلے جب بھاگاں اسے عورتوں کے اکٹھا ہو جانے کی اطلاع دیتی تو وہ کہتی :

" بہت اچھا ! بھاگاں ، ذرا بھاگ کر ایک بینز لے آؤ ۔ حلق تر کر لیں ۔ نہیں تو بالکل پاپڑ ہو جائے گا ۔"

بھاگاں بوتل لاتی اور وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے دیر تک اس کی چسکیاں لیتی رہتی ۔ بوتل ختم ہو جاتی تو وہ اپنا بیگ بھاگاں کو تھما کر اس کے ہمراہ کسی گھر کے صحن یا کھلے کمرے میں جمع عورتوں کے درمیان جا پہنچتی ۔

اس کے لیے ایک عدد کرسی جھاڑ پونچھ کر اور گدی سے سجا کر وسط میں رکھ دی جاتی جس پر وہ بڑی تمکنت سے بیٹھ جاتی اور اپنے ہونٹوں کو ایک خاص انداز سے موڑ کر مسکراتی اور مختلف جسموں اور پسینے کی بُو سے بچنے کے لیے اپنا نرم و نازک یوڈی کلون میں بھیگا ہؤا رومال ایک خاص ادا سے ناک پر رکھ لیتی ۔ اس کے یہ انداز عورتوں کی نظروں میں کھب کر فوراً انھیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیتے ۔ اور ایک مؤثر تقریر کے لیے راستہ ہموار ہو جاتا ۔ عورتیں کچھ کہنے سے پہلے سوچنے لگتیں :

" ان کی بھی کوئی زندگی ہے ۔ نہ اوڑھنے کو نہ پہننے کو نہ اچھا کھانے کو اور بچوں کا انبوہ خون چوسنے کو موجود ۔" پھر وہ دل میں اپنی بوڑھی ساسوں کو کوستیں :

" جنازے نکلیں ان کم بخت بوڑھیوں کے ، جو ابھی تک بیٹوں کے باغ میں نئے پھول کھلتے دیکھنے کی ہوس اپنے کالے دلوں میں دبائے بیٹھی تھیں ۔ مر کے پیچھا بھی نہیں چھوڑتیں ۔ روگ کی طرح

چمٹی بیٹھی ہیں - ارے انہیں نہیں مرنا تو ہم ہی اس زندگی کے عذاب سے چھوٹ جائیں -'' اور دلوں کا یہ غبار کسی وقت لاوے کی طرح زبان سے پھوٹ پڑتا پھر ساس بہو میں تو تکار شروع ہو جاتی -

'' ہم جائیں گے باجی جان کے پاس -''

'' کیسے جائیں گے ؟'' ساس ناک اچکا کر بیٹوں سے ناک چوٹی کٹوا دینے کی دھمکیاں دینے لگتیں -

وہ اشارے سے خاموش کرواتی -

'' کیوں ، مائی ، تیرا بیٹا کیا تنخواہ لیتا ہے ؟''

'' ڈیڑھ سو روپیہ -''

'' اور بچے -''

'' آٹھ -''

'' افوہ ! اتنے بچے اتنے کم پیسوں میں کیسے پلتے ہوں گے -'' اس کا دماغ پگھلنے لگتا - ان جاھل لوگوں کو کب عقل آئے گی - کب یہ اپنی زندگیوں کو بہتر بنانے کی جد و جہد میں حصہ لیں گے - کب اس کی محنت بار آور ہو گی -

'' کیوں ، مائی ، کیا کھا کر زندہ ہو ، کچھ بہو کا بھی خیال ہے ؟''

'' اللہ پالن ہار ہے - جو جی آتا ہے اپنا رزق ساتھ لاتا ہے -'' بوڑھیا نہایت قناعت سے جواب دیتی ، پھر بہو کی طرف منہ موڑ کر کہتی :

'' کیوں ری ، تو اس سگی کے پاس جا کر کیا دکھڑے روتی ہے - جس تھالی میں کھانا اسی میں چھید کرنا - ہم نے چارہ کھلانے کو بھینس تو نہیں باندھی - بچے جنتے کیوں موت آتی ہے -''

'' میں کب گئی -'' بہو گھبرا کر کہتی -

اور وہ بہو کی مدد کو پہنچ جاتی -

'' مائی ، تجھے کندھا دینے جو گے تو ہوگئے ہیں - تم اپنے بیٹے کو سمجھاؤ -''

'' کیا سمجھاؤں ؟'' بوڑھی ایسی خرانٹ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر طنز کرتی کہ باوجود اتنی دیدہ دلیر ہونے کے اس کا ماتھا بھیگ جاتا - وہ ناک مسلنے کے بہانے اپنے حواس درست کرتی اور فوراً دوسری طرف متوجہ ہو جاتی -

'' چھ سال میں چار بچے بہت ہو گئے - اب غصہ تھوک دو -

کیوں ؟'' عورت کھسیانی ھنسی کے ساتھ کہتی :
'' پھر میں کیا کروں ، باجی جان ۔''
'' تم میرے پاس آنا ۔''
اس کے بعد وہ چپکے بے رونق چہروں ، منکی سے بڑھے ہوئے پیٹوں اور چندھی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے ایک مؤثر تقریر کرتی ۔ نو بیاھتا یا ایک دو بچوں کی مائیں اسے جھینپی جھینپی نظروں سے دیکھتیں اور ایک دوسری میں کہنیاں گھسا کر اور پلو منہ میں دبا کر ھنستیں ۔ ادھیڑ عورتیں شکست خوردہ حسرت سے اسے تاکتیں اور بوڑھی چندھی آنکھوں میں حقارت غصہ اور طنز بھر جاتی ۔ اس کے خاموش ہونے پر کوئی تمسخر سے پوچھ لیتی :
'' کیوں ، بی بی ، اس نیک کام کا کیا معاوضہ لیتی ہو ؟''
'' کنواری ھو یا بیاھی ؟'' دوسری سوال کرتی ۔
'' بیاھی ہوگی ۔ کنواریوں کے منہ سے ایسی باتیں نکلتیں ھیں ۔''
تیسری لقمہ دیتی :
'' چودھویں صدی ھے ۔ قیامت کی نشانیاں ھیں ۔''
'' دیکھ لو ، چہرے پر کیا پھٹکار برس رھی ھے ۔''
'' مرنا یاد نہیں رہا ۔''
اس کا دل جل جاتا ۔ وہ تو ان کم بختوں کی بہتری کی سوچ رھی تھی اور وہ کیا سمجھ رھی تھیں ۔ خدا غارت کرے ان کمبختوں کو اس کا دل چاھتا ، سب کو ایک رسے سے باندھ کر اتنا پیٹے کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں — مگر اسے ضبط سے کام لینا پڑتا کیونکہ اس دردسری کے عوض اسے چند کیس ضرور مل جاتے تھے ۔ کام چل رہا تھا ۔
رات کو جب وہ جمیل کے مضبوط بازوؤں کے تنگ حلقے میں سمٹی ھوتی تو وہ ان جاھل عورتوں پر مزے لے لے کر پھبتیاں کستی اور قہقہے لگاتی ۔ ان قہقہوں کی آواز کسی دوسری جگہ بیٹھی خالہ معین کو نہ جانے کیوں بے چین کر دیتی ۔ اس کا سفید سر ھلنے لگتا اور اس کے زرد چہرے اور پھیکی سفید آنکھوں میں گویا آسیب گھروندے بنا لیتے ۔
وہ ماں سے ملنے یا گھر جانے سے گھبراتی تھی ۔ کیونکہ ماں جب ملتی ، اسے گہری گہری عجیب نظروں سے دیکھتی ۔ آخر ایک دن اس نے چپکے سے کہہ دیا :

" پرانی کھوئی کے پاس ایک بہت پہنچے ہوئے بزرگ آ کر ٹھیرے ہیں ۔ اگر کہو تو تمہیں کوئی تعویذ لا دوں ؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی :

" ماں یہ سب کچھ ہمارے ہاتھ میں ہے ۔"

" کیوں کفر بکتی ہو ۔ قدرت کا کون مقابلہ کر سکتا ہے !"

" اب ان باتوں میں کچھ زیادہ حقیقت نہیں رہی ، ماں ۔ اب سب کام اپنی منشا کے مطابق ہو سکتے ہیں ۔"

"توبہ استغفار پڑھو ، بیٹی ۔ یہی پٹی عورتوں کو پڑھاتی ہوگی ۔"

وہ ہنس دی :

" ہمارا رزق ، ماں ، اسی میں لکھا ہے ۔"

" خاک ایسے رزق پر ۔ شادی کے بعد دو چار بچے ہو جائیں تو مرد قابو میں رہتا ہے ۔" ماں نے ایک اور قیمتی نسخہ بتایا تھا ۔

"یہ پرانے وقتوں کی باتیں ہیں ۔ ماں اب تو مرد کو قابو میں رکھنے کا بس ایک طریقہ ہے کہ شادی کے بعد آٹھ سال تک بچے پیدا نہ کرو ، ہاں !" ماں اس کی بات سے بگڑ گئی تھی ۔ اس لیے صاف کہہ دیا تھا :

" بیٹی ،تو ہاتھ سے نکل گئی ۔"

لیکن یہ تو اس کا ذاتی تجربہ تھا ۔ جمیل کس طرح اس کی محبت میں بے بس ہو رہا تھا ۔ اس کی چاہت بے پایاں تھی ۔ دنیا میں گویا اس کے علاوہ اسے کچھ اور سوجھتا ہی نہ تھا ۔ دن رات وہ اس کی ناز برداریوں میں لگا رہتا اور شاید اسی وجہ سے وہ قدرے مغرور ہوگئی تھی ۔ اور گاہے گاہے اس کا رویہ جمیل کی طرف بھی تحقیر امیز ہو جاتا تھا ۔ مگر جمیل ہمیشہ ٹال جاتا —

ہر رات سونے سے پہلے وہ اس کے بیگ کی اشیا کو جو بے پروائی سے وہ ادھر آدھر پھینک چھوڑتی تھی اکٹھا کر کے بیگ میں رکھ دیتا اگر کسی دن کوئی چیز رکھنا بھول جاتا تو نفیسہ دفتر سے آ کر الٹی دھونس جماتی ۔ سارا دن پریشان رہی ۔

" تمہیں خود اپنا بیگ چیک کر لینا چاہیئے ۔"جمیل مشورتاً کہتا اور نفیسہ یونہی منہ بگاڑتی رہتی ۔

صبح جمیل بڑی محبت سے اس کے گال تھپتھپا کر اسے بے دار کرتا اور وہ آ لکسی کٹے پلنگ پر ادھر آدھر ٹانگیں پھینکتی اور ٹوٹی ٹوٹی انگڑائیوں کے درمیان کہتی :

" ارے کیا صبح ہو بھی گئی ؟"

" ہاں ، میری جان ، دس گھنٹے سو لیا ۔ اب آٹھ جاؤ ورنہ دفتر سے دیر ہو جائے گی ۔" یہ سنتے ہی وہ عموماً جھٹکا مار کر پلنگ سے آتر جاتی ۔ جمیل اس کے سلیپر پاؤں سے کھسکا کر آگے کر دیتا اور وہ انھیں پہن کر گنگناتی ہوئی غسل خانے کی طرف چلی جاتی لیکن بعض اوقات نیند کے خمار میں وہ سست پڑ جاتی اور اک ادا سے کہتی :

" ہم آج دفتر نہیں جائیں گے ۔"

جمیل کو بس اس کی اس ادا سے نفرت اور چڑ تھی ۔ اس کے چہرے کی شگفتگی فوراً رخصت ہو جاتی اور وہ سخت لہجے میں کہتا :

" ابھی چند روز پیشتر تم نے چھٹی کی تھی ۔ آخر آج چھٹی کرنے کا کیا مقصد ہے ؟ خواہ مخواہ ریکارڈ خراب ہو جائے گا ۔"

" بلا سے ہو جائے ۔ نوکری سے نکال دیں گے اور کیا کر لیں گے ۔"

" اور یہ کیا معمولی بات ہو گی ؟"

" بالکل ۔" وہ کاہلی سے کہتی ۔

جمیل کا چہرہ بگڑ جاتا :

" یہ کاہلی نہ دکھایا کرو ۔ اس طرح تو تم بہت جلد موٹی ، بھدی اور بوڑھی ہو جاؤ گی ۔ لو ، اب آٹھ جاؤ ۔"

جمیل کے بدلے ہوئے لہجے کو محسوس کر کے وہ پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھتی :

" کیا بات ہے ؟"

" تم بہت پریشان کرنے لگی ہو ۔" جمیل تیوری چڑھا کر کہتا اور وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے آٹھ بیٹھتی ۔ کوئی انجانا احساس اس کے سینے میں چبھن سی پیدا کر دیتا مگر یہ چبھن عارضی تھی ۔ بہت جلد محبت کی گرم جوشی میں وہ اسے بھول جاتی ۔

جمیل بہت کم اسے رنجش کا موقع دیتا تھا ، البتہ تنخواہ ملنے پر ان کے درمیان معمولی سی جھڑپ ناگزیر تھی ۔ اکثر تو نفیسہ روپے پیسے کی پروا نہ کرتی مگر کبھی کبھار جب وہ اپنی تنخواہ کا ایک حصہ اپنی کسی پرائیویٹ ضرورت پر خرچ کر چکی ہوتی تو جمیل کے حساب مانگنے پر جھنجھلا جاتی ۔ جمیل پیسے پیسے کا حساب پوچھتا تھا ۔

" تمھیں اس کا حق نہیں پہنچتا ۔" وہ چڑ کر کہتی ۔

" کیوں نہیں پہنچتا ؟ میں تو ضرور پوچھوں گا اور تمھیں بتانا ہو گا ۔" وہ ھنسی مذاق کی آڑ میں کہے جاتا ۔

" میں ایک لفظ نہ کہوں گی " وہ بگڑتی ۔

" ھمیں پیسے کی اشد ضرورت ہے اور تم ؟" جمیل سمجھاتا ۔ ایسے میں جمیل اسے بڑا نیچ اور لالچی نظر آتا ۔ پیسہ اس کے لیے اھمیت رکھتا تھا ۔ وہ پرس پھینک دیتی ۔

" لے لو ۔ جو کچھ ہے سب لے لو اور میری جان چھوڑ دو ۔"

" تم تو میری جان ھو ۔ تمھاری جان کیسے چھوڑ دوں ۔"

جمیل ڈھیٹوں کی طرح ھنستا ھوا پرس اٹھا لیتا اور پیسے مختلف مدوں میں تقسیم کرنے لگتا ۔ ساتھ ساتھ کہتا جاتا :

" دیکھ لو ، اس بار تم نے بہت زیادتی کی ہے ۔ پورا ایک سو کم ہے ۔" وہ دور پلنگ پر لیٹی اخبار کے صفحے اُلٹاتی رھتی ۔ کبھی زیادہ غصہ آ جاتا تو چلا کر کہتی :

" آئندہ میں ایک پیسہ نہ دوں گی ۔ اپنے ڈھائی سو میں سب پورا کرو ۔"

جمیل کھسیانے پن سے مسکراتا :

" ھاں بھئی ھماری کمزوری تمھارے ھاتھ میں ہے ۔ جتنا جی چاہے نیچا دکھاؤ ، طنز کرو ۔" مگر ساتھ ساتھ حساب کیے جاتا ۔

اس دن بھی تنخواہ ملی تھی اور وہ دونوں خوش و خرم ناشتے کی میز پر حساب کتاب میں مشغول تھے ۔ اچانک جمیل نے مسکرا کر کہا :

" اس بار تو تمھیں ترقی بھی ملی ہے ۔ پھر ھمیں کیا تحفہ دے رھی ھو — بازار میں ایک بہت اچھا پل اوور آیا ہے ۔ قیمت سو سے کم نہ ھو گی — پھر دے رھی ھو نا خرید کر ۔"

یہ کوئی نئی بات نہ تھی مگر اس وقت نفیسہ اس بات سے بدمزہ ھو گئی : " اوپر سے شاندار نظر آنے کے باوجود تم بہت نیچ آدمی ھو ۔"

اس نے نفرت سے کہا تھا اور جمیل ھنس دیا تھا پھر مسمی صورت بنا کر بولا تھا :

" ناراض کیوں ھوتی ھو ۔ تمھاری مرضی نہیں تو نہ سہی اور سنو ! نارمن وزڈم کی ایک بہت ھنسی والی پکچر ریلیز ھوئی ہے ۔

پروگرام بناؤ تو ایڈوانس بکنگ کروالوں ۔''

مگر وہ اس وقت سخت بے زار اور چڑچڑی ہو رہی تھی ۔ جمیل کو جواب دینے کی بجائے وہ کمرے میں داخل ہوتی ہوئی خالہ معین کی طرف متوجہ ہو گئی ۔

اور جب اس نے سرسری طور پر گھر کا حساب کتاب پوچھا تو دونوں کی آنکھوں سے اس انوکھی بات پر حیرت آمنڈ پڑی ۔ خالہ معین کا آسیبی چہرہ تو فوراً تأثر سے خالی ہوگیا مگر جمیل بھڑک اٹھا :

'' حساب میرے پاس ہے اور ، نفیسہ ، خالہ ہماری ملازمہ نہیں ہے ۔ یہ اس کا احسان ہے ہم پر اور تمہیں ...''

'' لیکن ؟''

'' بس ، نفیسہ ، یہ باتیں تمہیں نہیں بھبتیں ۔ تم انہیں خالہ معین پر چھوڑ دو ۔''

'' کیوں ؟''

'' تم گھر اور دفتر کا کام اکیلی کیسے نپٹا سکتی ہو ۔''

'' میں نوکری چھوڑ دینا چاہتی ہوں ۔ اس سے میری ذات کو فائدہ بھی کیا ہے ؟''

یہ بات بلا ارادہ اس کے منہ سے نکل گئی تھی ۔

مگر جمیل سناٹے میں آ گیا ۔

'' پھر کیا کرو گی ؟''

'' گھر کا کام !'' اس نے محض چڑانے کی خاطر کہا تھا کیونکہ اس کی ڈگر پر چلنے والی عورت ایسی مضحکہ خیز بات سوچ ہی نہیں سکتی اور یوں کہتے ہوئے وہ اپنے اس تصور پر مسکرا دی تھی :

وہ میلے کپڑے پہنے گھر کو جھاڑ پونچھ رہی ہے ۔ تخت پر لیٹی بچے کو دودھ پلا رہی ہے ۔ دروازے میں کھڑی سبزی والے سے مول تول کر رہی ہے ۔ دیوار سے سر نکالے پڑوسن سے گپ لڑا رہی ہے ۔ اس نے گھبرا کر سر کو جھٹکا تو ایک دوسری تصویر اس کے سامنے آ گئی ۔

وہ کہنیوں تک سونے کی پھنسی چوڑیاں پہنے نوکروں پر حکم چلا رہی ہے اور اس کے بہت سارے بچے اندر کمروں میں اودھم مچائے ہوئے ہیں ۔ اس نے ان سب کو گننے کی کوشش کی مگر دس تک پہنچ کر وہ گڑبڑا گئی اور اسے اپنے اس تصور سے ایسی گھن آئی کہ وہ اپنا پچھلا غصہ بھول گئی مگر جمیل اس کی مکسراہٹ

کو غلط سمجھ کر بولا :

"گھر کے کام کے لیے تو میں نوکرانی بھی رکھ سکتا تھا ۔ تم سے بیاہ کرنا کیا ضروری تھا ۔" جمیل کا چہرہ غصے سے بگڑ کر ایک اجنبی شخص کی صورت اختیار کر گیا تھا ۔

اس کے ذہن میں چھنا کا سا ہؤا ۔ وہ نئے سرے سے برافروختہ ہو کر بولی :

"پھر تو تم ایک جھوٹے اور خود غرض شخص ہو ۔"

"تم جو بھی سمجھ لو مگر فی الحال تم نوکری نہیں چھوڑو گی ۔"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے ۔"

"بے وقوف ، شادی کے بعد عورت کا کوئی معاملہ بھی ذاتی نہیں رہتا ۔"

"یہ تم کہتے ہو ؟"

"ہاں ۔"

وہ سنجیدہ نہیں تھی ۔ اگر جمیل غصہ دکھانے میں جلد بازی نہ کرتا تو بات مذاق میں ٹل جاتی ۔

مگر اب سوال انا کی حفاظت کا تھا اور وہ اپنے مؤقف پر ڈٹ گئی تھی اور اسے حیرت انگیز طور پر محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سوچ اتنی مضحکہ خیز نہ تھی بلکہ ایک ٹھوس حقیقت تھی اور اب تو اس کی زندگی اور زندگی کے اطمینان اور خوشی کا دارومدار ہی اس سوچ پر تھا ۔

اس دن وہ دفتر نہیں گئی ۔ جمیل غصے میں ناشتہ کیے بغیر اکیلا دفتر گیا اور دن بھر غائب رہا ۔ رات گئے جب وہ لوٹا تو وہ بستر پر بت بنی خاموش پڑی تھی ۔ کوئی بات کیے بغیر وہ اپنے بستر میں چلا گیا ۔

وہ ناراض تھا مگر اس کا حق اسے نہیں پہنچتا تھا ۔ یہ سوچ اس کے ذہن کو جھنجھوڑ رہی تھی ۔

صبح جب وہ بیدار ہوئی تو جمیل اس پر جھکا ہؤا تھا ۔ اس کی آنکھوں میں محبت اور چہرے پر وہی شگفتگی اور نرمی تھی — یقیناً وہ ایک اچھا اداکار تھا ۔ وہ منہ پھیر کر اٹھ بیٹھی ۔

اس دن کے بعد سے دونوں کے درمیان ایک کھنچاؤ سا پیدا ہوگیا تھا ۔ دونوں گویا کسی درمیانی تعلق کے بغیر دو مختلف کناروں سے ایک سمت میں بڑھ رہے تھے ۔

اب وہ ازخود کسی کل کی مانند بستر سے اٹھ بیٹھتی - ناشتے کی میز پر بھی دونوں خاموش رہتے - جمیل اخبار پڑھتا رہتا اور وہ کھانستے کھنکارتے چائے میں مصروف رہتی ـ خالہ معین سے اسے جانے کیا چڑ ہو گئی تھی - جب کبھی وہ پردے کے پیچھے سے اپنا سفید سر نکال کر اندر جھانکتی وہ بھنا جاتی اور بلاوجہ برتنوں کو میز پر پٹخنے لگتی - سفید سر پردے کے پیچھے چھپ جاتا مگر کہیں قریب ھی اس کی موجودگی کا احساس اس کے لیے اتنا شدید گھرا اور ناقابل برداشت ہوتا کہ وہ ناشتہ آدھورا چھوڑ کر آٹھ جاتی - اس کے آٹھتے ھی جمیل بھی اخبار پھینک کر آٹھ جاتا - وہ خواہ کتنی تیزی دکھاتی مگر جمیل بھی بروقت تیار ہو جاتا -

" تم میرے لیے یہ زحمت نہ کیا کرو - میں ٹیکسی سے چلی جایا کروں گی -"

ایک دن اس نے بڑی رکھائی سے کہا تھا -

" ٹیکسی میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں -" جمیل نے سختی سے جواب دیا تھا -

" ھاں ، یہ تو بڑی فضول خرچی ہوگی -" اس نے جل بھن کر کہا تھا اور بیگ آٹھا کر گیٹ کی طرف لپکی تھی اور جمیل کے سکوٹر نکالتے نکالتے وہ سڑک کا موڑ کاٹ گئی تھی - جب جمیل نے سکوٹر اس کے قریب لے جا کر روکی تو وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا - وہ پہلے کی طرح ھنسنا بولنا اور مذاق کرنا چاھتا تھا مگر نفیسہ اتنی خاموش اور گھمبیر تھی کہ وہ بات کرنے کا حوصلہ نہ پا سکا - نفیسہ کو آفس کے قریب آتار کر جب اس نے سکوٹر موڑا تو اس نے دل میں ارادہ کر لیا تھا کہ وہ آج اس سرد جنگ کو ختم کر دے گا -

رات کو اس نے اسے گھیر لیا :

" ناراض ہو ؟"

" میں کیوں ہوتی -"

" چلو معاف کرو -"

" کس بات پر ؟"

" کسی بھی بات پر -"

" میں ضرورت یا ذریعہ نہیں ہوں -"

" کون کہتا ہے ؟"

"تم سمجھتے ہو - میری اپنی ایک حیثیت ہے -"

"ضرور ہے اور میں تمھیں تمھارے لیے چاہتا ہوں -"

"اچھا !" نفیسہ بڑے استہزا سے ہنسی -

"تم ایک جھوٹے اور خود غرض آدمی ہو - جب میں تمھارے بازوؤں کی گرمی کو محبت کی گرمی سمجھ رہی تھی تو دراصل میں خود غرضی کی آگ میں بھسم ہو رہی تھی - ہمارا یہ تعلق کس قدر کمزور اور کچا ہے - میں غلط سوچتی رہی ہوں - آؤ ، اس تعلق کو ختم کر دیں -"

نفیسہ سسک پڑی -

جمیل نے اسے نرمی سے تھپکا : "تم بے وقوف ہو !"

"مجھے اب احساس ہؤا ہے میری زندگی کس قدر کھوکھلی اور غیر یقینی ہے — اور میرا مستقبل نامعلوم ! ہمارا تعلق ختم ہو جانے والا — مگر یہ تصور کتنا جان سوز ہے کیا ہم نیا تعلق نہیں پیدا کر سکتے ؟" اس نے معنی خیز نظروں سے جمیل کی طرف دیکھا تھا -

"مگر تمھاری ملازمت کا کیا بنے گا ؟"

نفیسہ کے دل پر جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا -

اپنے برافروختہ جذبات پر قابو پانے کے لیے اسے چند لمحے خاموش رہنا پڑا - غصے سے اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے مگر وہ کمال ضبط سے مسکرائی -

"خالہ معین جو ہیں پھر ہمیں کس بات کا فکر ہے -"

"ہاں مگر سوچ لو نوکری نہیں چھوڑنے دوں گا — ابھی ہمیں اپنے مستقبل کو تعمیر کرنا ہے -"

"کاش تم کچھ زیادہ پڑھے لکھے ہوتے -" نفیسہ نے جل کر کہا -

جمیل کھسیانے پن سے ہنس پڑا :

"مگر پھر شاید تم اس جگہ نہ ہوتیں - میں ضرور کسی اونچے طبقے کی لڑکی سے شادی کرتا -"

"اچھا -" نفیسہ کا دم گھٹ سا گیا -

"وہ وہاں کیوں تھی ؟ کیوں تھی —؟

اس کی خاموشی کو بھانپ کر جمیل نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور مسکرا کر بولا :

"بس اتنا سا دل ہے تمھارا ! واہ میں تو مذاق کر رہا تھا -"

اپنی بڑائی جتانے کا یہ اچھا حربہ تھا -

مگر جمیل نے اس کی خواہش کو رد نہیں کیا تھا اس لیے وہ دل میں کڑھنے اور جمیل کے خلاف نفرت محسوس کرنے کے باوجود خوش تھی -

اب وہ دن رات نئے منصوبے بنایا کرتی ، چپکے چپکے ، جن کی خبر جمیل کو ہرگز نہ تھی -

وہ اپنے بچے کو خالہ کی ٹھنڈی آغوش میں ہرگز نہیں پلنے دے گی - وہ اسے خود پالے گی - اپنی گود میں کھلائے گی ، اپنے سینے سے چمٹائے گی اور خود لوریاں دے گی ، وہ اس کے لیے جیسے گی ، اور جب وہ جمیل کو اس نئے بندھن میں جکڑے گی تو پھر وہ اسے اپنے دل سے یوں دور محسوس نہ کرے گی ؛ اور اگر جمیل تب بھی یونہی خود غرضی دکھائے گا تو اسے کیا پروا ہو گی ! ہاں ، مگر اس سے پہلے اسے خالہ معین کو اس گھر سے نکالنا ہوگا - نہیں تو وہ گھر کی طرح اسے بھی سنبھال لے گی اور یہ گھر اس کا کبھی نہ ہو سکے گا اور نہ کبھی وہ زمین کے اس ٹکڑے پر نڈر ہو کر اور قدم جما کر کھڑی ہو سکے گی -

دن آہستہ آہستہ گزر رہے تھے مگر وقت کی یہ رفتار کس قدر صبر آزما تھی - وہ کسی انوکھی بات کی منتظر تھی - پھر بھی سست رفتار وقت ھوا ہو کر ایک سال میں ڈھل گیا اور وہ حیران رہ گئی -

کسی انجانے خوف نے اس کے دل پر پنجے گاڑ دیے اور وہ پریشان اور خوف زدہ سی نظر آنے لگی - وہ تنہائی میں اپنے بانس جیسے لمبے اور سوکھے جسم کو ٹٹولتی جس پر نشیب و فراز بے معلوم سے تھے بلکہ کافی حد تک سپاٹ ! اس جسم کی جمیل نے کئی بار تعریف کی تھی مگر جمیل کے سچ اور جھوٹ میں امتیاز مشکل تھا -

وہ چور اور دزدیدہ نظروں سے آئینے میں دیکھا کرتی - اس کا چہرہ پھیکا ، بے رونق اور زرد تھا - اتنی فراغت اور بے فکری کے باوجود وہ شباب کی چمک دمک سے محروم ، سوکھی اور مرجھائی ہوئی تھی - آج تک اس نے اپنے آپ پر غور نہیں کیا تھا - اس کی زندگی اتنی مصروف اور خوش گزاری تھی مگر اب وہ بڑی فکرمندی سے اپنا جائزہ لیا کرتی - جمیل اس کے مقابلے میں حسن و شباب کا مجسمہ تھا اور اسے اپنے مقابل دیکھ کر اس کا دل اور بھی گھٹ جاتا - وہ پہلے تو ایسی نہ تھی ، وہ سوچا کرتی -

پھر اس کی نظریں بلاوجہ خالہ معین پر پڑنے لگتیں اور خالہ کے خلاف اس کے دل میں دبی ہوئی نفرت شدت اختیار کر گئی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ خالہ کو کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیتی ۔ کسی منحوس سایے کی طرح وہ اس سے چمٹ گئی تھی ۔ یہ وہم اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ جب تک خالہ معین اس گھر میں موجود ہے اسے خوشی اور اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا ۔ کبھی کبھار وہ اپنی ان سوچوں پر غور کرتی تو اسے تأسف سا ہوتا ۔

آخر خالہ معین کا قصور بھی کیا تھا ؟ وہ ان کے گھر کو اپنا گھر سمجھ کر اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی ۔ کبھی اس نے کسی بات پر ماتھے پر تیوری نہ ڈالی تھی نہ کبھی شکایت کا کوئی لفظ منہ سے نکالا تھا ۔ پھر وہ اس کے خلاف دل میں نفرت کیوں پال رہی تھی؟ مگر وہ اس سے شدید نفرت کرتی تھی ۔ اور اس نفرت کو دل سے نہیں نکال سکتی تھی ۔ راتوں کو کئی بار وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ۔ اسے خالہ معین کا سفید سر اپنے اوپر جھکا دکھائی دیتا اور وہ اس کے سوکھے استخوانی ہاتھوں کو اپنے جسم پر پھرتا محسوس کرتی ۔ وہ گھبرا کر بیڈ سوئچ آن کر دیتی ۔ خالہ کا سایہ فضا میں لہرا کر غائب ہو جاتا ۔ جمیل کی آنکھ کھل جاتی ۔

”کیا بات ہے ، جان ؟“

”کچھ نہیں“ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے کمرے میں چاروں طرف دیکھتی ۔

کوئی برا خواب دیکھا ہے ؟“

”ہاں ۔“

”چلو سو جاؤ ۔ صبح دیر سے اٹھوگی تو دفتر وقت پر نہ پہنچ سکو گی ۔“

وہ ٹھنڈا سانس لے کر بتی بجھا دیتی ۔

پھر کسی وقت اس کا پیٹ بوجھل ہو جاتا ۔ اسے یوں لگتا جیسے اس کے پیٹ کے اندر لوہے کا گولا چکر کاٹ رہا ہے ۔ وہ گھبرا کر اپنا پیٹ ٹٹولنے لگتی ۔

دفتر سے بھی اس کی طبیعت اچاٹ ہوگئی تھی بلکہ یہ کام اس کے ضمیر پر ایک بوجھ بن گیا تھا ۔

وہ عجیب عجیب باتیں سوچتی ۔ کبھی اسے محسوس ہوتا جیسے وہ عورت نہیں رہی اور ایسی ہکی باتیں منہ سے نکال نکال کر اس کی

صورت آجڑ گئی ہے ۔

وہ رو کھے پھیکے بیزار چہروں والی عورتوں کے درمیان بیٹھی تو خود کو مجرم سا محسوس کرتی ۔ رٹے رٹائے مؤثر جملے اسے بھول جاتے اور وہ اصل مسئلے کی بجائے مختلف قسم کے سالن پکانے اور بچوں کی شرارتوں پر بات چیت شروع کر دیتی ۔

کوئی حاجت مند عورت اس کے پاس آتی تو وہ ٹال مٹول کر جاتی یا ضروری اشیا نہ ہونے کا بہانہ کر دیتی اور اس دن جب انہیں کے سنٹر میں کیس بگڑ گیا تو وہ سخت پریشان ہوئی تھی ۔ کئی دن اس پر مردنی سی طاری رہی ۔ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے اس عورت کا خون سے خالی سفید چہرہ گھوم جاتا تھا ۔ اس نے جمیل سے بھی ذکر کیا تھا :

”میرا جی چاہتا ہے کوئی اور نوکری ڈھونڈ لوں ۔“

” تم تو بیوقوف ہو ۔ نوکریاں کہاں ملتی ہیں ! پھر ایسی باتیں تو ہوتی رہتی ہیں ۔ تم کیوں اپنا دل چھوٹا کرنے لگتی ہو؟“

وہ خاموش ہو رہی ۔ ان دنوں وہ جمیل سے خاصی دبنے لگی تھی ۔ کئی بار اسے محسوس ہوتا جیسے جمیل کی آنکھوں میں طنز ابھر رہا ہے ۔

کبھی وہ پوچھ بیٹھتا :

” نفیسہ ، تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے ؟“ تو وہ گھبرا جاتی اور نظریں چراتی ۔

” ہاں ٹھیک ہے ۔ تم کیوں پوچھتے ہو ؟“

” ویسے ہی ۔“ جمیل گہری نظروں سے اسے دیکھ کر مسکرا دیتا اور وہ بوکھلا جاتی ۔

وہ اسے کیا جتانا چاہتا تھا ؟ ۔ وہ دیر تک ذہنی اضطراب میں مبتلا رہتی ۔

اس دن مسز وحید اچانک آ نکلی ۔ یقیناً کسی نے اس کے خلاف کان بھرے تھے ۔ وہ خاصی جھنجھلائی ہوئی تھی ۔

” کنویسنگ کے باوجود کیس کیوں نہیں ملتے ؟“

” بیک ورڈ علاقہ ہے ۔“

” یہیں تو زیادہ کوشش کی ضرورت ہے ۔“

” کرتے تو ہیں ۔“

” میں نے اس کے برعکس سنا ہے ۔“

وہ خاموش رہی ۔ مسز وحید نے فائل کو آلٹ پلٹ کر دیکھا ۔
"ہمیں کیس چاہئیں ، کیس ! ہر حالت میں ۔"
"میں کیا کر سکتی ہوں ؟"
"سنو ۔" مسز وحید اچانک کچھ سوچ کر بولی ۔
"ہم پرفارمنس اتنا لو شو نہیں کر سکتے ۔ تمہیں غلط اندراج کرنا پڑے گا ۔"
"میں غلط نہ لکھوں گی ۔"
"جن لڑکیوں سے ٹارگٹ پورا نہیں ہوتا وہ یہی کام کرتی ہیں ۔ بس ذرا ہوشیاری کی ضرورت ہے ۔"
"مگر مجھ سے یہ نہ ہو گا ۔"
"تو اس کا نتیجہ تم خود بھگتو گی ۔"
"بھگت لیں گے ۔" اس نے تیزی سے جواب دیا تھا ۔ مسز وحید کی بات سے وہ سخت بھنا گئی تھی ۔ اس دن ویسے بھی اسے ہسپتال اپنی ایک لیڈی ڈاکٹر سہیل سے ملنے جانا تھا ۔

مسز وحید کے روانہ ہوتے ہی اس نے بھی آفس بند کر دیا ۔ ہسپتال میں اس کی سہیلی نے بڑے غور سے اس کی بپتا کو سنا اور اس کے بچگانہ خوف پر قہقہہ لگایا :

"یہ تو بہت کم مدت ہے ۔ ابھی سے فکر مند ہونے کی کیا بات ہے ۔ ویسے تم دو چار دن میرے پاس آؤ ، میں سب دیکھ لوں گی ۔"

اس نے بڑے اعتماد سے اس کے شانے کو تھپتھپایا تھا ۔
"بالکل فکر نہ کرو ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔"
"اچھا !"

وہ حیرت اور خوشی کے جذبات لیے گھر پہنچی ۔ مسز وحید سے جھڑپ لینے کے بعد اس کا موڈ خراب ہوگیا تھا مگر اب وہ اب بالکل ہشاش بشاش تھی ۔ اور اس کی بشاشت کو جمیل نے بھی محسوس کیا تھا ۔

"کیا بات ہے ؟ آج بہت خوش ہو !"
"ہاں !"
"کیوں کیا ڈبل ترقی ملی ہے ؟"
"وہ ہنس پڑی : " بس تمہیں ایسے ہی خواب آتے ہیں ۔"
"پھر ؟"

" کوئی ہو گی بات ۔"

" کیا بات ؟"

" سب باتیں نہیں بتائی جاتیں ۔

اس نے گہرے لہجے میں کہا جو شک میں ڈالنے والا تھا ۔ اور جمیل سچ مچ شک میں پڑ گیا ۔ اس نے گہری تیکھی نظروں سے اسے دیکھا اور مسکرا کر بولا : " ہوں !"

وہ جمیل کو شک میں ڈال کر اور بھی خوش ہوئی ۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اس کے سینے میں وہ راز آ جائے جسے بتا کر اس کا سر تن جائے ، اور جو جمیل کی طنز بھری نظروں کا بھرپور جواب ہو ۔۔ مگر ابھی اسے کچھ اور انتظار کرنا تھا ۔

چند دن وہ بہت خوش و خرم دکھائی دیتی رہی ، پھر آہستہ آہستہ اس کی خوشی شک میں بدلنے لگی اور ایک دن جب وہ ہسپتال سے نکلی تو اس کے چہرے پر مایوسی کی پرچھائیاں کانپ رہی تھیں وہ کھوئی کھوئی اور سخت پریشان تھی ۔ اسے اپنی سہیلی کی کہی ہوئی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا ۔

" یہ ناممکن ہے ؟"

" میرا خیال ہے یہ سب کچھ بعد میں ہوا ۔ آخر تمہیں شروع میں ایسی احتیاط پسندی کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی ؟ تمہاری آمدنی بھی معقول ہے ۔"

اس کی زبان گنگ ہو گئی ۔ وہ کیا کہتی ؟ یہ سب جمیل کے لالچ کا نتیجہ تھا ۔ وہ برباد ہو گئی تھی مگر اسے کیا فرق پڑا تھا ۔ وہ اب بھی ویسا تھا ۔ مگر وہ خود بھی بے قصور نہ تھی ۔ وہ خود اس کی قائل تھی اور کیسے بھیانک طریقوں سے کنوینسنگ کرتی تھی ۔

جب وہ مردہ قدموں سے سڑک پر آئی تو اسے محسوس ہوا جیسے بہت سے ننھے منے نرم و نازک ہاتھ اس کے پیچھے تالیاں پیٹ کر اس کا تمسخر اڑا رہے ہیں ۔ اس نے گھبرا کر ایک رکشا کو اشارہ کیا اور اس میں سوار ہو گئی ۔

گھر پہنچ کر اسے سکون سا محسوس ہوا ۔ جمیل گھر پر نہیں تھا ۔ وہ تنہائی میں اس مسئلے پر غور کر سکتی تھی ، مگر اب غور کرنے کو کیا بچا تھا ؟

اس دن جمیل رات گئے لوٹا ۔ وہ جلد بستر پر چلی گئی ۔ وہ جمیل کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی ۔

صبح ناشتے کی میز پر دونوں کا سامنا ہؤا تو اسے دیکھ کر وہ قدرے حیران رہ گیا :

" کیا بات ہے ؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ؟ "

" ہاں ٹھیک ہے " اس نے اکھڑے لہجے میں کہا اور جمیل چونک کر بولا :

" کہیں مسز وحید سے جھڑپ تو نہیں ہو گئی ؟ "

" ہاں ہوئی تھی " اس نے ٹالنے کو کہا تھا ۔

" کس بات پر ؟"

" پرفارمیں غلط بھرنے کو کہہ رہی تھی " وہ بے خیالی میں بولے جا رہی تھی ۔

" تو بھر دیتیں !"

" کیوں ؟ "

" رپورٹ ہو جائے گی ۔"

" ہو جائے ۔"

" نوکری ؟ "

" ایسی نوکری کو آگ لگے " نفیسہ بھڑک اٹھی :

" میں خود استعفیٰ دے دوں گی ۔"

" یہ ضد بھی خوب ہے " جمیل نے تلخی سے کہا اور نفیسہ کا گلا رندھ گیا ۔

اس کے دکھ کو کون سمجھے گا ، کون اسے دلاسا دے گا ؟ وہ اپنا دکھ بانٹنا چاہتی تھی مگر کس سے ؟ وہ جمیل سے یہ کیونکر کہہ سکتی تھی کہ وہ اب عورت نہیں رہی ۔ جمیل یقیناً اس کا تمسخر آڑاتا ۔

" تم پہلے بھی عورت نہ تھیں ۔ اب خواہ مخواہ دوسروں کو الزام نہ دو ۔ اپنی صورت دیکھو ۔"

اور وہ جمیل کے اس بہتان کو غلط ثابت نہ کر سکتی تھی ۔ اور یہ خالہ معین ! وہ بالکل بے بس تھی اور خود شک میں مبتلا ہو گئی تھی ۔

" مجھے آج جلد پہنچنا ہے " اس نے بھرے گلے سے کہا تھا اور ناشتہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی تھی ۔

وہ لمبی اور سیدھی سڑک پر بے تکان بڑھے جا رہی تھی ۔ وہ کہاں جا رہی تھی ، اسے کچھ علم نہ تھا ۔ اس کا ذہن مفلوج اور

حواس غائب تھے ۔ وہ ایک غلط راستے پر آگے بڑھ رہی تھی اور یوں تیزی سے بڑھ رہی تھی جیسے کوئی بلا اس کے تعاقب میں ہو ۔ اس دن فضا میں حبس اور گھٹن تھی اور سانس لینا دشوار تھا ۔ وہ چلتی گئی حتیٰ کہ اس کے پاؤں شل ہو گئے اور اسے اپنے آپ پر رحم آنے لگا ۔ وہ ایک بس سٹاپ پر رک گئی ۔ اس کا حلق پیاس کی شدت سے خشک ہو رہا تھا اور جسم پسینے سے تر تھا ۔ اپنی مظلومیت اور بے بسی کو محسوس کرکے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں ۔ آنسوؤں کے بے شمار قطرے لڑھک کر اس کے برقع کے نقاب میں جذب ہو گئے ۔

اسے اچانک اپنا گھر یاد آیا ۔ آرام دہ اور پرسکون گھر ! پھر اسے جمیل کا خیال آیا جو کرسی میں دھنسا اطمینان سے اخبار دیکھ رہا ہو گا ۔ وہ اس کے متعلق سوچے گا بھی نہیں ۔ کاش وہ اس کے دل کے قریب ہوتا ۔ تب اس نے محسوس کیا کوئی شے مقناطیس کی طرح پیچھے کی طرف کھینچ رہی ہے ۔ مگر وہ ایک غلط راستے پر بہت آگے بڑھ آئی تھی ۔ وہ ایک کونے میں کھڑی ہو گئی ۔

تبھی ایک عورت نے آگے بڑھ کر پوچھا :

" بیٹی ، یہاں سے کون سے نمبر کی بس چلتی ہے ؟"

یہ اسے مخاطب نہیں کیا گیا تھا ۔ اس نے شش و پنج میں اپنا منہ پھیر لیا ۔ بے وقوف ناسمجھ عورت ، کیا وہ دیکھ نہیں سکتی ۔ اس کا شک اسے چاروں طرف سے گھیر رہا تھا اور اس کی آنکھیں جل تھل تھیں ۔

ایک بس ، سٹاپ پر آ کر رکی تو سب سواریاں جو اتفاق سے عورتیں تھیں اس کی طرف لپکیں ۔ وہ بھی بلا سوچے سمجھے بڑھی مگر قریب پہنچ کر ٹھٹھک گئی ۔ اس کے قدموں کو زمین نے جکڑ لیا ۔ یہ بس عورتوں کے لیے تھی ۔ کیا وہ سوار ہو سکتی ہے ؟ وہ ٹھٹھکی کھڑی تھی ۔ اچانک لیڈی کنڈکٹر نے سر نکال کر دیکھا ۔

" کہاں جائیں گی آپ ؟"

باوجود کوشش کے وہ اپنے حلق سے کوئی آواز نہ نکال سکی مگر اسی کشمکش میں وہ بس پر سوار ہو گئی ۔ اور کھڑکی کے قریب اسے جگہ مل گئی ۔

بس کے چلتے ہی عورتوں نے نقابیں آلٹ لیں اور گرمی کی شکایت کرنے لگیں ۔ وہ نقاب گرائے خاموش بیٹھی تھی ۔

اچانک دائیں ہاتھ بیٹھی سواری نے اسے مخاطب کیا :

" کہاں جاؤ گی ۔"

وہ خاموش رہی مگر سواری باتونی تھی دوبارہ بولی :

" افوہ آج تو غضب کی گرمی ہے ۔ برقع بھی آگ ہو رہا ہے ۔ اے بہن ، نقاب آلٹا لو ۔ عورتوں سے کیا پردہ !"

اس کے حلق سے چیخ سی نکل گئی اور اس نے نقاب کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنا منہ کھڑکی سے باھر نکال لیا ۔

موم کا شہر

مسعود اشعر

" یہ بھارت ناٹیم کا ایک روپ تلانا ہے ۔"

اس نے مجھ سے کہا ، پھر طبلے والے کو ھدایات دیں اور اس شخص سے ، جسے وہ چچا کہتی تھی ، کچھ مشورہ کیا اور دوپٹہ کمر سے باندھ کر ناچنا شروع کر دیا ۔

میں نے اپنے اردگرد دیکھا ۔ وھاں بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی ۔ طبلے والا بھی فرش پر ھی تھوڑی سی جگہ صاف کر کے بیٹھ گیا تھا ۔ اس کا چچا ایک طرف دیوار سے لگا کھڑا تھا ۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور دوسری دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ھوگیا ۔

جب طبلے کی تھاپ کے ساتھ پاؤں کی دھمک ھوئی اور ھال کے چوبی فرش سے گرد اڑی تو مجھے خیال آیا کہ آرٹ سرکل کے سیکریٹری نے یہ کیوں پوچھا تھا کہ ناچنے والی کون ہے ۔ پھر میں نے دیکھا کہ تلانا ناچنے والی کے پیروں سے جو گرد اڑ رھی ہے وہ میرے پیروں پر جم رھی ہے ۔ میں ایک دم پیچھے ھٹ گیا اور پاؤں جھٹک کر گرد جھاڑنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس وقت تک سارا ھال گرد سے بھر چکا تھا اور ناچنے والی کے قدموں سے برابر دھول اڑ رھی تھی ۔ میں نے اس شخص کی طرف دیکھا جو سامنے دیوار سے لگا کھڑا تھا مگر اس کا چہرہ گرد میں غائب ھو چکا تھا ۔ صرف اس کا دھڑ نظر آ رھا تھا جو سب چیزوں سے بے نیاز تھا ۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر ناک پر رکھا اور رقص پر توجہ مرکوز رکھنے کے لیے ناچنے والی کے بالوں کے جوڑے کے نیچے کھلی گردن اور اس کے نیچے قمیض سے جھانکتی ننگی پیٹھ کو دیکھنا شروع کر دیا کیونکہ جب وہ طبلے والے کو ھدایات دے رھی تھی تو اس کے جسم کا یہی حصہ میرے سامنے تھا ۔

آرٹ سرکل کے سیکریٹری کی بیگم سے میں نے پانی مانگا تھا اور وہ پانی لینے اندر گئی ھی تھیں لیکن میں چلا آیا تھا اور اب سوچ رھا تھا کہ میں نے پانی کیوں نہیں پیا تھا ؟ مجھے پانی پی لینا چاھیے تھا ۔ وہ چوکیدار سے ھال صاف کرانا بھول گئی تھیں اور میں پانی

پینا بھول گیا تھا ۔ سیکریٹری صاحب نے پہلے مجھے حیرت سے دیکھا تھا پھر یہ معلوم کر کے کہ ناچنے والی کون ہے اپنی بیگم کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا ۔

" میں تو جا رہا ہوں ۔ چوکیدار سے اوپر والا ہال کھلوا دینا ۔"

پھر اس کے جسم کا وہ حصہ بھی گرد میں تحلیل ہو گیا جس نے میری توجہ کو ایک مرکز دے رکھا تھا اور میری نظریں پھر اس کے پیروں کی طرف چلی گئیں جو گرد آلود تھے اور جن سے دھول اڑ اڑ کر میرے پیروں پر جم رہی تھی ۔ مجھے شدید پیاس لگی اور اور محسوس ہؤا کہ میرے سامنے والے دانتوں کے درمیان کا خلا اور بھی چوڑا ہو گیا ہے اور میں نے اس سے کہا :

" چلیے ، آپ کو گھر چھوڑ آؤں ۔"

اس نے گھبرا کر رقص بند کر دیا اور خاموشی سے میری طرف دیکھا مگر میں اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا ۔

" کل اپنے گھر ہی ریہرسل کر لینا ۔" میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا ۔

" جی ؟" یہ اس کے چچا نے پوچھا ۔

" یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے ۔"

" ٹھیک تو ہے !" یہ بات بھی اس کے چچا نے ہی کہی ۔

" یہ ہال ہمیں صرف ایک دن کے لیے ملا تھا ۔" میں نے جھوٹ بولا ۔ دراصل میں مزید پگھلنا نہیں چاہتا تھا ۔

" ہارمونیم اور سارنگی والے کا کیا ہو گا ؟"

" انہیں بھی آپ گھر ہی بلا لیجیے ۔" میں نے بڑے مربیانہ انداز میں کہا اور سامنے آئینے میں اپنی شکل دیکھنے لگا ۔

شام کو ٹھیک چھ بجے میں کل پاکستان انجمن فلاح عامہ کے سیکریٹری کی کوٹھی میں کھڑا تھا ۔ وہ باہر لان میں ہی بیٹھے تھے ۔

" آئیے ، آئیے ! بیگم آپ ہی کا انتظار کر رہی تھیں ۔"

پھر بیگم بھی آ گئیں اور ہم اندر ڈرائنگ روم میں چلے گئے ۔

" کب ہے آپ کا فنکشن ؟"

" جی ، ہفتے کی رات کو ۔"

" اچھا پھر تو صرف پانچ دن رہ گئے ہیں ۔"

" بس وہ اچانک ہی پروگرام بن گیا ۔"

" اصل میں مشکل یہ ہے کہ اتنی جلدی لڑکیوں کو جمع کیسے کیا جائے گا !"

" مگر بیگم یہ تو فلاحی کام ہے !" سیکریٹری صاحب نے ہماری سفارش کی ۔

" بہرحال لڑکیوں کے لیے ایک آدھ ریہرسل تو ضروری ہے ۔"

میں نے رحم طلب نظروں سے سیکریٹری صاحب کی طرف دیکھا ۔ انھوں نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود بولنے لگے اور جب تک چائے آئی بیگم راضی ہو چکی تھیں ۔

" مجھے کتھک کا بہت شوق ہے ۔" وہ میرے ساتھی کو بتا رہی تھیں ۔

" آزوری اسے مسلم رقص کہتی ہے ۔"

" میں نے گوپی کرشن سے سیکھا ہے ۔" بیگم نے میرے ساتھی کی بات نہیں سنی ۔

" گوپی کرشن ؟" میں نے پوچھا ۔

" جی ہاں ۔" سیکریٹری صاحب بولے ۔ " ۵۵ء میں بیگم بمبئی گئی تھیں ۔"

" میں دو ہفتے رہی بمبئی ۔"

" صرف دو ہفتے !"

" کیوں ؟ دو ہفتے میں نہیں سیکھا جا سکتا ؟" مجھے اپنے ساتھی کی بات بہت بری لگی ۔

بیگم نے میری طرف دیکھا اور اپنے بیلے کا ذکر کرنے لگیں ۔ سیکریٹری صاحب نے بتایا کہ یہ ایک نہایت Symbolic بیلے ہے ۔ اس کا موضوع تو خیر اور شر کا تصادم ہے لیکن اسے جس انداز میں پیش کیا گیا ہے اس سے انسانی تہذیب کے تمام ادوار ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں ۔

" اور پھر ۔" بیگم نے اضافہ کیا " یہ سارا کھیل امیچور لڑکیوں نے تیار کیا ہے ۔"

پھر بیلے کی کسی علامت پر بحث چھڑ گئی ۔ میرا ساتھی بھی اس میں شامل ہو گیا ۔ میری نظریں سامنے دیوار پر ناچتی ہوئی پدمنی کی تصویر پر ٹک گئیں اور میں نے دیکھا کہ گرد بھرے فرش پر طبلے والا گٹھری بنا پڑا ہے ۔ اور تلانا ناچنے والی ہاتھوں سے اپنے پیروں کی گرد صاف کرنے کی کوشش کر رہی ہے ۔ پھر میں نے بیگم

کے صاف شفاف پیروں کی طرف دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔
"اچھا اب اجازت دیجیے۔"
کلچرل کمیٹی کے ایک رکن نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا :
"اس کی فائنل ریہرسل ضرور دیکھ لینا چاہیے۔"
"کس کی ؟"
"اسی ناچنے والی کی۔"
"کیوں ؟"
"بھئی ، اگر اس نے کوئی بے ہودہ رقص کر دیا تو کیا کرو گے ؟"
"مگر وہ تو تلانا ناچ رہی ہے۔"
"تلانا ؟"
"ہاں ہاں۔ بھارت ناٹیم کا ایک حصہ ہے۔"
"ہنہہ ! اس سالی کو کیا پتا بھارت ناٹیم کیا ہوتا ہے اور تلانا کس چڑیا کا نام ہے !"
"مگر وہ تو اپنے گھر ریہرسل کر رہی ہے۔"
"پھر کیا ہوا ؟"
"ہوا یہ کہ ہم تو اس کے گھر نہیں جاتے۔"
"کیوں ؟ شرم آتی ہے اس کے گھر جاتے ؟ وہ تو اب شریفوں کے محلے میں رہتی ہے۔"
بیگم نے اپنا ڈرائنگ روم نہایت فن کاری کے ساتھ سجا رکھا تھا جہاں مغربی مصوروں کے شاہکار Reprints کی شکل میں موجود تھے۔ وہاں شاکر علی سے ایس صفدر تک اوریجنل صورت میں آویزاں تھے۔ خطاطی کے خوبصورت نمونے اور آیات کے طغرے بھی دیواروں کی زینت تھے۔ آتشدان کو ملتان کے نیلے ٹائلوں سے مزین کیا گیا تھا۔ لیمپ شیڈ سارے کھجور کے پتوں یا اونٹ کی کھال کے ، گلدان سرکنڈوں کے جن میں گیہوں کی بالیاں سجی ہوئی ، ایک طرف مٹی کی صراحیاں اور جالی دار کٹورے رکھے تھے تو دوسری طرف جام پور کے قریب کھدائی کے دوران ملنے والے برتنوں کے ٹکڑے۔ لکڑی کے ایک بہت خوبصورت اسٹینڈ پر بدھ کی مورتی رکھی تھی جس کے بارے میں ان کا بیان تھا کہ تخت بھائی کی پہاڑیوں کی سیر کرتے ہوئے انہیں ملی تھی۔ آرام دہ صوفہ سیٹ کے ساتھ ایک کونے میں رنگ برنگی لکڑی کی سندھی پیڑھیاں بھی رکھی تھیں جو یقیناً بیٹھنے

کے لیے نہیں تھیں ۔ سامنے ایک تخت پر گاؤتکیوں کے ساتھ طبلہ سارنگی اور دیگر ساز نہایت قرینے سے رکھے تھے ۔ میں نے محسوس کیا کہ اس گھر میں مجھے پیاس نہیں لگی ۔

میں ہار گیا اور تلانا ناچنے والی کی بوڑھی ماں نے جلدی جلدی صحن میں کرسیاں لا کر ڈالیں تو میں نے اس سے کہا :

'' ذرا پانی پلا دیجیے ۔''

میری پیاس اب بھی نہیں بجھی تھی اور وہ چائے بنانے میں لگ گئی تھی ۔ تلانا ناچنے والی بہت خوش تھی اور ننگے پاؤں ادھر آدھر بھاگی پھر رہی تھی ۔

'' یہ دس سال کی تھی جب اس نے ناچ سیکھنا شروع کیا تھا '' اس کی بوڑھی ماں نے باورچی خانہ سے کہا ۔ '' اصل میں یہ اس کی نانی کا شوق تھا ۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا ۔ وہ ایک کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے کی طرف جا رہی تھی ۔ اس کا چچا گھر پر نہیں تھا ۔ طبلے سارنگی والے بیٹھے تھے ۔ اس کی چھوٹی بہن نے برآمدے میں دری بچھائی اور وہ گھنگرو باندھنے لگی ۔

'' اسے بھی نانی کا سا شوق ہے ۔ دیوانی ہوئی پھرتی ہے ناچ کے لیے ۔''

وہ گھنگرو باندھنے میں مگن تھی ۔ اس نے ہماری باتوں پر بالکل توجہ نہیں دی اور میں اس کے گھنگرو دیکھ رہا تھا ۔

'' آپ کے جلسے میں وزیر بھی آئیں گے ؟ '' اس کا چچا آ گیا تھا ۔

'' ہاں ، وزیر اطلاعات ہمارے مہمانِ خصوصی ہوں گے ۔''

میرے ساتھی نے بڑے رعب سے اسے اطلاع دی اور اس ناچنے والی نے چھن سے گھنگرووں پر ہاتھ مار کر خوشی کا اظہار کیا اور کھڑی ہو گئی ۔

بیگم کی کوٹھی سے آرٹ سرکل کے ہال کا فاصلہ کم ہے اور تلانا ناچنے والی کے گھر سے زیادہ لیکن استاد ننھے خاں کے میوزک اسکول کے بعد سے آرٹ سرکل کا ہال خالی پڑا ہے اور اب بیگم کہتی ہیں کہ اس ہال پر ہمارا حق ہے ، ہم اس کا انتظام سنبھال لیں گے ۔ میں بیگم کی یہ باتیں سنتا ہوں اور ان کے پاؤں کی طرف دیکھتا ہوں ۔ پھر ہال کے چوبی فرش کو اپنے ہاتھوں سے ان پیروں کے

لیے صاف کرنے لگتا ہوں جو گردآلود ہیں مگر وہ پاؤں ایک دم
مٹی کے بن جاتے ہیں ۔ بے جان مٹی کے ! اور ہال کا چوبی فرش
کیچڑ میں لتھڑ جاتا ہے اور میرے ہاتھ پاؤں دونوں کیچڑ سے
بھر جاتے ہیں ۔ میں اپنے ہاتھ پاؤں صاف کرنے کی کوشش کرتا
ہوں اور پھر مٹی کے پیروں کی طرف دیکھتا ہوں لیکن اب مجھے
ایسا لگتا ہے کہ یہ پیر وہ نہیں ہیں جو پہلے میں نے دیکھے تھے
بلکہ یہ کسی اور کے پاؤں ہیں اور اب وہ مٹی کے بھی نہیں رہے ۔
میں ان پاؤں کو خوب جانتا ہوں لیکن اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے
کہ یہ کس کے ہیں ۔

پھر اچانک مجھے یاد آ گیا کہ یہ کس کے پاؤں ہیں اور میں
نے جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کیا اور کھڑا ہو گیا ۔

کلچرل کمیٹی کی میٹنگ میں بہت ہنگامہ ہؤا ۔ ایک صاحب
نے اطلاع دی کہ انجمن فلاح عامہ کے سیکریٹری کی بیگم بہت
ناراض ہیں ۔

" کیوں ناراض ہیں ؟ " میں حیران ہو گیا ۔

" آپ کو معلوم نہیں کیوں ناراض ہیں ؟ "

" مجھے کیا معلوم ! مجھ سے تو انہوں نے کچھ نہیں کہا ۔ "

" وہ پروفیشنل ناچنے والی کے ساتھ اسٹیج پر نہیں آسکتیں ۔ "

" مگر ! ـــ ان کا آئیٹم تو الگ ہے ! "

" ہؤا کرے ۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا ۔ "

" بہت دماغ خراب ہے ان کا ۔ " مجھے غصہ آ گیا ۔ " ان سے
کہہ دیجیے وہ تشریف نہ لائیں ۔ "

" پھر پردے وغیرہ کہاں سے آئیں گے ؟ "

واقعی پردے کہاں سے آئیں گے ؟ یہ تو میں نے سوچا ہی
نہیں تھا ۔ اتنی جلدی آرائش کے سامان کا بندوبست کہاں سے ہوگا ؟

" مگر یار " اب میرا غصہ ختم ہو گیا ۔ " وہ تو ایسی
پروفیشنل نہیں ہے ۔ " میرا مطلب طوائف سے تھا ۔

" یہ سب کچھ بیگم سے جا کر کہو ۔ "

ٹھیک ہے میں جاؤں گا ان کے پاس ! بھلا یہ بھی کوئی بات
ہوئی ۔ ان کی وجہ سے ہم اپنا پروگرام تو خراب نہیں کر سکتے اور
وہ بہرحال فن کار ہے اور بیگم فن کی قدر کرتی ہیں ۔

اس رات اچانک گرمی بہت بڑھ گئی اور نہ جانے کہاں سے

بے شمار مچھر نکل آئے ۔ میں رات بھر جاگتا رہا اور تھوڑی دیر بعد اٹھ کر پانی پیتا رہا اور جب میں سیکریٹری صاحب کی کوٹھی میں داخل ہؤا تو اس وقت تک بیگم کو رضا مند کرنے کے لیے بہت سی باتیں سوچ چکا تھا اور اس کے ساتھ یہ بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اگر بیگم نہ مانیں تو ان سے لڑائی لڑی جائے گی ۔

" آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا ؟" وہ واقعی بہت غصے میں تھیں ۔

" جی ؟" میں انجان بن گیا ۔

" آپ کے یہاں تو پروفیشنل ڈانسر بھی ناچ رہی ہے ۔" انھوں نے نہایت حقارت سے میری طرف دیکھا ۔

میں خاموش رہا ۔

" ہم نے تو محض آپ کے کلب کی وجہ سے ھامی بھر لی تھی ورنہ ہم ناچنے والے تو ہیں نہیں ۔"

" مجھے ان کی آخری بات بہت بری لگی : " جی دیکھیے نا ! اس میں پروفیشنل ..."

" نہیں ، صاحب ! ھماری لڑکیاں اس کے ساتھ نہیں ناچ سکتیں ۔"

میں نے نہایت غصے میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر مجھے یاد آیا کہ رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے میری زبان کی نوک پر دانہ نکل آیا ہے اور میں زیادہ بات نہیں کر سکتا ۔ پھر میں نے اپنی گردن سیدھی کی اور سیکریٹری صاحب کی طرف دیکھا ۔

" بات یہ ہے " اب سیکریٹری صاحب کی باری تھی ۔ "ساری لڑکیاں اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں ۔ ان کے والدین یہ کیسے برداشت کر لیں گے کہ ..."

اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں بہت سے رنگ بکھر گئے ۔ پہلے وہ گڈمڈ تھے پھر ایک ایک کر کے الگ الگ ہوتے چلے گئے ۔

" آؤ ، آؤ !" بیگم بڑے پیار سے ان لڑکیوں کی طرف دیکھ رہی تھیں ۔" یہ صاحب وہ فنکشن کرا رہے ہیں ۔" ان کے لیے میرے نام کی کوئی اہمیت نہیں تھی ۔ پھر وہ سنبھل کر بیٹھ گئیں اور میری طرف دیکھا ۔ میری زبان اور بھی گنگ ہو گئی تھی ۔

" ان کے والد سیکشن آفیسر ہیں ۔" انھوں نے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا ۔ میں نے اس لڑکی کو دیکھا اس کے ماتھے پر چاند چمک رہا تھا ۔

" اور یہ مشہور انڈسٹریل کمپلیکس کے مینیجنگ ڈائریکٹر کی لڑکی ہیں ۔" اس کی ٹھوڑی پر ستارہ جھلملا رہا تھا ۔

" یہ شہر کے بہت پرانے خاندان کی چشم و چراغ ہیں ۔" اس کے گالوں سے سورج کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں ۔

" اور ان کے والد کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے ۔ مشہور ایم ۔ پی ۔ اے ہیں ۔" اس کی آنکھوں میں شفاف آئینے جگمگا رہے تھے ۔

پھر وہ سارے چہرے ایک دم موم کے بن گئے — بے جان ، بے حس ! جن پر صرف مسکراہٹ کھدی ہوئی تھی اور آنکھوں کے شیشے چمک رہے تھے ۔ پھر وہ مجسمے پگھلنا شروع ہو گئے اور ان کی شکلیں تبدیل ہونے لگیں ۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کے چہروں کی طرف دیکھا مگر ہونٹوں کی لکیروں اور آنکھوں کے سوراخوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا ۔ میں نے اپنی عینک آتار کر اس کے شیشے صاف کئے اور کھڑا ہونے لگا مگر سیکریٹری نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا ۔ میں وہاں سے نہیں اٹھ سکتا تھا !

" اس کے گھر کون جائے گا ؟"

" تم جاؤ گے اور کون جائے گا ۔"

" میں ! میں تو ہرگز نہیں جاؤں گا ۔"

" تم نے اسے تلاش کیا تھا ۔ اب تم ہی اسے روکو ۔"

" یہ نہیں ہو سکتا ! ہرگز نہیں ہو سکتا !"

مگر اس کی گلی کے سامنے والی سڑک پر جب میں نے تیسرا چکر لگایا تو قطعی ارادہ کر لیا کہ اس بار گلی میں گھس کر اس کا دروازہ ضرور کھٹکھٹا دوں گا اور اس سے کہہ دوں گا کہ اس کے پیروں کے نیچے سے مٹی کا فرش بھی نکل چکا ہے ۔ پھر گلی کے عین سامنے والی پنواڑی کی دکان پر کھڑے ہو کر آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا اور رومال سے اسے خوب صاف کیا ۔ سگریٹ موجود تھے لیکن ایک اور پیکٹ خریدا اور ناریل کی سلگتی ہوئی رسی سے ایک سگریٹ جلا کر لمبے لمبے کش لینے لگا ۔

زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ وہ ناراض ہو جائے گی ؟

ہو جائے ناراض ! کون سے اس سے تعلقات رکھنا ہیں ۔

میں نے سگریٹ زمین پر پھینک کر جوتے کی نوک سے اسے مسل دیا اور گلی کی طرف مڑا لیکن اچانک زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے ۔ سامنے سے تلانا ناچنے والی کا چچا آ رہا تھا ۔ میری سمجھ

میں کچھ نہیں آیا اور فوراً دکان کے برابر والی گلی میں گھس گیا اور جب تک وہ اپنی گلی میں غائب نہیں ہو گیا وہاں کھڑا رہا۔

"بھئی ، مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔"

"تم نے اس سے کہا تھا۔ تمہیں اسے منع کرو!"

پھر یہ طے ہوا کہ پرچہ لکھ کر اس کے گھر بھیج دیا جائے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔

اور اس رات گیارہ بجے تک میں بیگم کی کوٹھی پر بیلے کی ریہرسل دیکھتا رہا۔ بیگم نے اپنے وسیع برآمدے میں چاندنی بچھا رکھی تھی اس پر خوش شکل اور خوش پوش لڑکیوں کے خوبصورت جسم حرکت کر رہے تھے۔ یہ ڈریس ریہرسل نہیں تھی لیکن لڑکیوں نے عام لباس ھی میں بیلے کی حقیقی فضا قائم کر رکھی تھی۔

لان سے آڈیٹوریم کا کام لیا گیا تھا۔ اور اس میں مہمانوں کے لیے کرسیاں بچھی تھیں جو اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ یہ بیلے ہے یا ڈانس ڈرامہ اور بیلے اور ڈانس ڈرامے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ میرے پاؤں سختی کے ساتھ زمین پر جمے ہوئے تھے اور میں سب کچھ بھول چکا تھا۔

"کون ہو تم!"

رات کے ساڑھے گیارہ بجے میرے گھر کے نزدیک ایک سایہ میری طرف بڑھا۔

"میں بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں" یہ تلانا ناچنے والی کے چچا کی آواز تھی۔ میں خاموش رہا۔

"اس نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔"

"کیوں؟ رو کیوں رہی ہے؟" میں انجان بن رہا تھا۔

"آپ نے پہلے اس سے کہا کیوں تھا؟"

"بھئی میں مجبور ہوں۔" میں آگے بڑھ گیا۔

"اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔" وہ میرے پیچھے پیچھے برآمدے تک چلا آیا تھا۔

"ہم پیسے دے دیں گے۔"

"جی!" اس نے اتنے زور سے آواز نکالی کہ میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔" آپ سمجھتے ھیں یہ صرف پیسوں کی بات ہے؟"

"پھر کیا بات ہے؟" میں بغیر سوچے سمجھے بول رہا تھا۔ میں اس سے فوراً پیچھا چھڑا لینا چاہتا تھا۔

" صاحب میں کیا عرض کروں ۔" یہ اس نے اس طرح کہا جیسے کھڑے سے گر گیا ہو ۔ میں نے اب پہلی بار اس کی طرف دیکھا وہ برآمدے میں لٹکتے ہوئے بلب کے نیچے کھڑا تھا ۔ اس کی آنکھوں پر گہرا سایہ تھا اور لمبی سی ناک عجیب ہیبت ناک انداز میں روشنی کی طرف آگے کو نکلی ہوئی تھی ۔ اس کی آنکھیں جو تاریکی میں تھیں سچ بول رہی تھیں میں گھبراہٹ میں جوتے کی نوک سے زمین کریدنے کی کوشش کرنے لگا لیکن میرے جوتوں کے نیچے ننگی زمین نہیں تھی ، اینٹوں کا پختہ فرش تھا اور میں نے اس کی آنکھوں سے ڈر کر کہہ دیا ۔

" اچھا تم جاؤ ۔ کل دیکھیں گے ۔"

کل کیا دیکھیں گے ؟ اس نے یہ سوال نہیں کیا اور خاموشی سے چلا گیا ۔ مگر میں نے اپنے آپ سے بہت سے سوال کیے اور رات بھر نہ جانے کس کس سے کیا کیا سوال کرتا رہا لیکن جواب ایک سوال کا بھی نہیں ملا ۔

دوپہر کو بارہ بجے جب روشنیوں کا انتظام مکمل ہو چکا تھا اور اوپن ایئر اسٹیج کے درختوں پر پردوں کے لیے کیلیں گاڑی جا چکی تھیں تو بیگم کا فون آیا ۔

" ہماری لڑکیاں نہیں آئیں گی " وہ بہت غصہ میں تھیں ۔

" جی !" میں گھبرا گیا ۔

" اس ڈانسر کو آپ نے منع نہیں کیا ۔"

" کون سی ڈانسر ؟" یہ میرے منہ سے نکل گیا تھا ۔ میں کہنا کچھ اور چاہتا تھا ۔

" آپ ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہیں !"

" جی آپ کیا فرما رہی ہیں ؟"

" وہ ڈانسر آپ کے فنکشن میں ناچ رہی ہے ! " انھوں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا ۔

" آپ کو کس نے بتایا ؟ "

" طبلے والے نے ۔"

" طبلے والے نے ؟"

" ہاں ! آج صبح ہی وہ اس کے گھر گیا تھا ۔"

" مگر آپ کے پاس وہ کیسے آ گیا ؟ "

" ہمارے بیلے میں بھی وہ طبلہ بجاتا ہے نا!" وہ جھنجھلا گئی ۔

" اچھا ! تو آپ کا اور اس کا طبلے والا مشترک ہے ؟" میرا جی چاھا زور سے قہقہہ ماروں مگر ان کا پارہ اور بھی چڑھ گیا تھا اور نہ جانے کیا کیا کہے جا رھی تھیں ۔ میں نے صرف پردوں کا ذکر سنا اور مجھے ھوش آگیا ۔

" مگر بیگم صاحب ! وہ بھلا کیسے آ سکتی ہے ۔ طبلے والا غلط کہتا ہے ۔"

" بس آپ سمجھ لیجیے !" وہ ٹھنڈی پڑ گئیں ۔

" اچھا آپ سامان تو بھیج دیجیے ۔"

پھر میری ہنسی خشک ھو گئی اور حلق سوکھ گیا ۔ اس کا چچا میری بات کا کیا مطلب سمجھا تھا ؟ اور پھر صبح سے اب تک میں نے کسی شخص کو رات کی بات کیوں نہیں بتائی تھی ؟

" اس کو ناراض ھو جانا چاھیے تھا !" میں نے اپنے ساتھی سے کہا ۔

"کس کو ناراض ھو جانا چاھیے تھا ؟"

" اس ناچنے والی کو ۔"

"کیا ، یار ، بغیر تمہید کے بات کرتے ھو ۔" وہ جل گیا "کیوں ناراض ھو جانا چاھیے تھا ؟"

" ھم نے اس کی بے عزتی جو کی ہے ۔"

" ھنہ ! اس سالی کی بھی کوئی عزت ہے !" اور وہ پیانو گھسیٹ کر ٹھیک کرنے لگا ۔

" مگر اب کیا ھو گا ؟"

" تم ھی جانو ! مجھے کیا پتا ۔"

مگر وہ یہاں آنے کے لیے بے چین کیوں ہے ؟ یہ سوال میں نے اپنے آپ سے کہا اور میں کس سے ڈرتا ھوں ؟ اجلے پیروں سے یا گرد آلود پیروں سے ؟ لیکن اپنے تمام سوالوں کی طرح میرے پاس ان سوالوں کے جواب بھی نہیں تھے ۔

سیکریٹری صاحب پہلے ھی پہنچ گئے ۔ انھوں نے اسٹیج کی آرائش کا انتظام فوراً اپنے ھاتھ میں لے لیا ۔ روشنیوں کا صحیح مقام متعین کرنا، پردے لگانا ، مائکروفون نصب کرنا اور اناؤنسر کے لیے علیحدہ میز ڈالنا ، یہ سارا کام انھوں نے خود ھی کھڑے ھو کر کرایا ۔ پھر آخری بار آڈیٹوریم کی سیڑھیوں پر جا کر " فل لائٹ " کا حکم دیا اور .O. K کے ساتھ وہ اسٹیج پر کرسی ڈال کر آرام سے بیٹھ گئے ۔

اور اناؤنسمنٹ کرنے والے کو ھدایات دینے لگے ۔

میرے لیے کوئی کام نہیں تھا مگر ایک دم مجھے محسوس ہوا کہ میں بہت تھک گیا ھوں اور زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا ۔ پہلے میں نے اسٹیج پر بیٹھنے کی کوشش کی مگر سیکریٹری صاحب کے تیور دیکھ کر نیچے اتر گیا اور دور جا کر سیڑھیوں پر بیٹھ گیا ۔

تھوڑی دیر میں بیگم اپنے قافلے کے ساتھ پہنچ گئیں اور اسٹیج کا رہا سہا نظام بھی ان کے ھاتھ میں چلا گیا ۔ دوسرے گانے والے اور سازندے بھی آ گئے تھے ۔ مہمان بھی آنا شروع ھو گئے تھے ۔ میں نے پتلون سے اپنے ھاتھ صاف کیے اور پیچھے والی سیڑھی کا سہارا لے کر آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی کہ یکلخت ایک لڑکا میرے اوپر آ کر گرا ۔

" آپ کو باھر ایک آدمی بلا رہا ھے ۔"

" کون آدمی ؟" مگر مجھے معلوم تھا وہ کون آدمی ھے ۔

" اس کے ساتھ ایک عورت بھی ھے ۔ وہ انھیں اندر آنے نہیں دیتے ۔"

" کون اندر نہیں آنے دیتا ؟" میں نے اپنی سانس پر قابو پانے کے لیے آھستہ آھستہ سوال کیا ۔

" وہ دروازے والے ۔"

" ان سے کہہ دو وہ یہاں نہیں ھیں ۔"

اور جب بیگم کا بیلے شروع ھوا تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کی تمام لڑکیوں کے گھنگھروؤں کے نیچے آڑا پاجامہ نہیں تھا ۔ میں نے زور سے اپنے پیروں پر سے گرد جھاڑی اور باھر نکل گیا ۔

دھبے

ظہور الحق شیخ

چائے کی پیالی میں ، چائے میں ، ہوا میں ، ہاتھوں ، انگلیوں ، میزوں پر ــ جدھر دیکھو ادھر ہی دھبہ ۔ غلیظ ، مزیدار ، بدبودار ، عنابی ، سیاہ ، حرکت کرتا ، چرا پھٹا دھبہ ، اس کے دماغ پر چھا گیا ۔

" اوھوں ۔" اسے گویا متلی آنے لگی ۔

" یہ تو میرے ہونٹوں سے لگ رہا ہے " اور پھر اس کے ہونٹ اسے چومنے کو حرکت میں آ گئے ۔

اس نے اپنے سامنے ایک پہاڑی کھوہ بڑھتی دیکھی ۔

" دھبہ ، ہوں ، ہوں " گویا اسے قے آنے لگی ہو ۔

" جی ہاں ۔ بجا فرمایا آپ نے ۔ یہ دھبہ تو ساری عمر میرے کردار پر لگ جاتا " اس کے ساتھی نے اس کے منہ سے دھبے کا لفظ سن لیا تھا ۔

" ہم سب لوگ کس طرف جا رہے ہیں ، یار ؟ کس راستے پر ؟" وہ بولا اور پھر آنکھیں نیم وا کیے چائے کی چسکی لینے لگا ۔

" آج کچھ عجیب سی لگ رہی ہے یہ چائے !" اسے چائے سے نفرت سی ہو رہی تھی ۔ " اُفوہ ، چائے سے بھی سڑاند آ رہی ہے ۔" اس نے دل میں سوچا ۔

" کیوں ، ٹھنڈی تو نہیں ہو گئی کہیں ؟" اس کے ساتھی نے کہا ۔ اور وہ خاموش رہا ۔

" سڑاند ــ" وہ سوچ رہا تھا ۔ " کبھی تو یہ مجھے بہت ہی اچھی لگنے لگتی ہے " اس نے زبان تالو سے سہلاتے ہوئے سوچ جاری رکھی ۔

اور پھر اس نے دیکھا کہ سامنے چھانگے مانگے کے گھنے جنگلوں میں ایک الگ تھلگ جگہ ہے ۔ ایک طرف چٹائی بچھی ہے ۔ پاس ٹرانزسٹر چل رہا ہے ۔ مالٹوں اور گنڈیریوں کی ٹوکری کے قریب ہی چھلکے پڑے ہیں ۔ کوئی اس جگہ کو نہیں دیکھ سکتا ، کوئی ادھر کا رخ نہیں کر سکتا ۔ چٹائی کے پاس ہی ایک ڈبہ ہے جس میں مٹھائی پڑی ہے ۔ ایک پیکٹ میں چرغے اور تکے پڑے ہیں ۔ اور وہ دھبہ

کھول رہا ہے - جیدی اس کے سامنے پڑا ہے -

'' ویسے پیسٹری بڑی مزیدار ہے ان کی -'' اس نے اپنے ہونٹ چوستے ہوئے کہا - '' آہا ، مزا آ گیا '' اس نے دل میں سوچا - ''بوسہ اسی طرح لیا جاتا ہے '' اس نے خود سے کہا -

'' تم نے بہت ہمت کی - میں تو حیران ہوں بلکہ خوش ہوا ہوں یہ سن کر '' اس نے اپنی پتلون درست کی اور اپنی ایک ٹانگ دوسری پر رکھتے ہوئے کہا - '' شرافت بڑی چیز ہے -''

'' بس شکر کیجیے '' جیدی نے کہا اور اس نے اور چائے کا آرڈر دے دیا -

'' کچھ نہ پوچھو ، جیدی ، مجھے کتنا دکھ ہوا ہے تمہاری داستان سن کر -'' اس نے ہوا میں کچھ سونگھنا چاہا '' مگر تمہیں پتا کیسے چلا ؟''

'' بس جب کار میں بیٹھا تو مجھے ایسے ہی کچھ شبہ سا ہوا — یوں کہہ لو قسمت اچھی تھی - بچ جو جانا تھا -''

'' مگر تم ؟ — تم کود سکتے ہو ؟ — میرا مطلب ہے بڑی دلیری دکھائی تم نے -'' دونوں خاموش ہو گئے -

'' خوب ، تو چھلانگ لگا دی -'' اس نے پھر کہا -

'' بس تقریباً تقریباً -''

'' صبح کی بات ہے یا شام کی '' اس نے آنکھیں بار بار جھپکتے ہوئے کہا -

'' صبح کو بھائی — میں نے بتایا نا کہ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ جس طرح ہم روزانہ شام کو شیزان میں بیٹھتے ہیں ، ایسے ہی ہو سکتا ہے کوئی صبح کا پروگرام ہو ان کا -''

'' ٹھیک -'' وہ بولا -

'' مگر آپ پریشان سے کیوں ہو گئے -'' جیدی نے پوچھ لیا -

'' نہیں - نہیں ... ہاں یار - بس بات ہی ایسی ہے تمہاری -'' اس نے سر کو دوبارہ زور سے ہلایا -

'' خوبصورتی بھی گناہ ہے اس دنیا میں -'' جیدی نے کہا -

'' ذلیل لوگ ہیں یہ - ان جیسا ہر کوئی تھوڑی ہے -'' اس نے جواب دیا -'' میں خود بھی تو ذلیل ہوں - یہ کیا سوچ رہا ہوں -'' اس نے دل ہی دل میں خود کو ڈانٹ پلائی -

اتنے میں چائے آ گئی -

شوکت اور جیدی کی دوستی اگرچہ چند ہی دنوں سے شروع ہوئی تھی پھر بھی وہ بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ وہ روزانہ شام کو انڈس میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے بارے میں بھی گفتگو چھڑ جاتی ۔ آج شام جب وہ ملے تو شوکت نے جیدی سے اچانک سوال کر دیا ۔

" یار تمہارے عبدل سے بڑے تعلقات ہؤا کرتے تھے ۔ مگر اب کبھی تمہیں اس سے ملتے نہیں دیکھا ۔"

" یہ نہ پوچھو ، شوکت بھائی ۔"

" مگر وہ تو بڑی بکواس کرتا پھرتا ہے ۔"

" جھوٹ ہے ۔ بالکل جھوٹ ۔"

" خیر وہ تو ہے ہی ۔ مگر تم بھی تو کچھ بولو نا ۔"

اتنے میں چائے آ گئی اور جیدی نے چائے بناتے ہوئے اسے اپنی داستان سنانی شروع کر دی ۔

" ہؤا یوں کہ ایک دن میری اسلم کی معرفت عبدل سے دوستی ہو گئی ۔ وہی اسلم نا ، جو میرے پیسے کھا کر بھاگ گیا تھا ۔ تو صاحب ، میں نے محسوس کیا کہ محترم عبدل صاحب کچھ عجیب سا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں ۔ دراصل مجھے وہ گھورتا رہتا اور بڑے اوچھے انداز میں گفتگو کرتا ۔ میں اسے پسند تو نہ کرتا تھا خیر اب اٹھنا بیٹھنا جو ہوگیا تو میں بھی چپ رہا ۔ یوں بھی تو میری سلیم پارٹی سے آن بن ہو گئی تھی ۔ وہ کون سے بڑے نیک تھے ۔ بہتان تراشی تو ختم ہے ان پر بھی ۔ ہاں تو دفع کرو ان کو ، عبدل صاحب کی کارکردگی سن لو ۔ جناب عبدل مجھے گھورتے رہتے ۔ میں بھی خاموش رہا ۔ انہوں نے پیچھا نہ چھوڑا ۔ ایک دن مذاق مذاق میں اسے میں ہومو کہہ بیٹھا ۔ بس پھر کیا تھا ۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا ۔ آنکھیں غصے سے باہر آ گئیں ۔" جیدی نے پسینہ پونچھتے ہوئے چائے کی چسکی لی ۔

" ہاں تو پھر ۔" شوکت بولا ۔

" پھر ۔ یار میں کہتا ہوں ، دفع کرو اس واقعے کو ۔ کوئی اور بات کریں ۔" جیدی نے کہا ۔

" مگر پتا تو چلے آخر اس کی بکواس کا مطلب کیا ہے ؟"

" بس یار ۔ یونہی ۔ میں نے بتایا نا کہ وہ غصہ کھا گیا ۔ مجھے

پتا نہیں تھا معاملہ یہ ہے۔ادھر اس نے اسے دل میں رکھ لیا ۔ میں سمجھا تھا بات آئی گئی ہو گئی ۔ مگر وہ تو ... بس یوں سمجھ لو اسے اپنی کمینی حرکت کا بہانہ مل گیا ۔ اس نے لڑکے جمع کیے اور مجھے اغوا کرنے کا پروگرام بنا لیا ـ شرم ہمیں تو آتی ہے ، شوکی بھائی ـ ایسی باتیں سنا کر بھی...''

'' اچھا ـ بڑا ذلیل آدمی ہے ۔''

'' کہنے لگا ، اب اسے ہومو بن کر دکھاؤں گا ۔''

'' بڑے کمینے خیالات ہیں سالے کے ۔'' شوکت کچھ سوچتے ہوئے بولا اور پھر اسے چاروں طرف عنابی ، سیاہ ، حرکت کرتے ، چرے پھٹے ، چائے کی پیالی میں ، چائے میں ، ہوا میں ، ہاتھوں ، انگلیوں ، میزوں پر دھبے ہی دھبے نظر آنے لگے ۔

'' عبدل ہے بڑا حرامزادہ ـ بڑی شے ہے ۔'' اس نے دل میں سوچا ۔

'' کہاں لے جا رہا تھا وہ ؟'' اس نے پوچھا ۔

'' چھانگے مانگے ۔''

'' چسکے لیتا ہے ۔ چسکے ۔'' وہ دل میں بولا ۔

چائے آ گئی تو اس نے ایک پیالی خود پی اور دوسری جیدی کو دی ۔ اس دوران میں وہ خاموش رہا اور جیدی نے بھی کوئی بات نہ کی ۔

'' نہیں ، نہیں ۔ یہ مجھے بھائی کہتا ہے ـ مگر بھائی کہنے سے کیا ہوتا ہے ۔ بری بات ہے ۔'' وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سوچ رہا تھا ۔

'' چھی چھی ۔'' اچانک اس کے منہ سے نکل گیا ۔

'' آپ تو صرف چھی چھی کر رہے ہیں ۔ وہ بھی تو ہیں جو ایسی حرکت کرتے ہیں ۔'' جیدی بولا ۔

'' بدمعاش ! لعنت بھیجو ، یار ، ان پر ۔'' اس نے ہلکے ہلکے چمچہ میز پر بجانا شروع کر دیا ۔

چائے ختم ہو گئی تو جیدی نے کہا ۔ '' آؤ ، شوکت ، چلتے ہیں کہیں ۔''

'' کہاں ؟''

'' ویسے ہی پھریں گے ۔ میری طبیعت اداس ہے ذرا ۔''

'' چلو ۔'' شوکی نے جواب دیا ۔ ''شکر ہے میں بھی اس دھبوں بھری دنیا سے نکلوں گا ۔'' اس نے گویا اطمینان کا سانس لیا ۔

انھوں نے بل دیا اور ریستوران سے باہر آ گئے ۔ جیدی نے کار اسٹارٹ کی اور وہ جلد ہی شہر سے دور نکل آئے ۔

'' شوکت ، میں سوچتا ہوں دنیا کتنی کمینی ہے ۔''

'' بس ، چپ ہی کر رہو ۔'' اس نے جواب دیا ۔ '' کمینہ ، کمینی ۔۔ بڑا مزےدار لفظ ہے ۔'' وہ دل میں کہہ رہا تھا ۔

'' اب دیکھو نا ۔۔ اس نے مجھے مفت میں بدنام کر دیا ۔''

'' ارے ، ارے سامنے دیکھو ۔ ابھی تمھاری ضرورت ہے ۔'' جیدی کی ٹکر ہوتے ہوتے بچی ۔

'' یار ۔ میں بہت اپ سٹ ہو گیا ہوں ۔''

'' ہاں یار ۔ تمھارے لیے بات ہی اپ سٹ ہونے کی ہے ۔''

'' لیکن کوئی علاج ؟''

'' علاج ! میں کہتا ہوں ، بھونک کر چپ ہو جائے گا ۔''

'' شوکت ، جیدی کا دل کرتا ہے کہ مر جائے ۔''

'' ارے واہ ۔ بھلا اس میں مرنے والی کون سی بات ہے ۔''

شوکت اپنے ہونٹ چبا رہا تھا ۔ '' میری جان ۔۔ بوں بس ، ابھی سے ۔۔ چھوڑو ۔'' اس نے سوچتے ہوئے کار کی کھڑکی کے باہر دیکھا : '' اندھیرا ۔۔ اُف اندھیر بھی کیا چیز ہے ۔ بڑا چالاک لگتا ہے مجھ کو ۔۔ بڑا سیکسی ہے ، آوارہ ۔''

ایک دم جیدی نے گاڑی روک لی ۔ شوکت چونک سا گیا ۔ اس نے جیدی کو دیکھا ۔ وہ سٹیرنگ سر پہ رکھے بیٹھا تھا ۔

'' مگر یہ تو دھبوں سے بھرا ہے ۔'' وہ جیدی کو حیران ہو کر دیکھ رہا تھا ۔

'' جیدی ، جیدی ۔۔ جیدی ، بولتے کیوں نہیں !'' اور جیدی ٹس سے مس نہ ہؤا ۔

'' زیادتی ہوئی ہے اس سے ۔۔ اچھا لڑکا ہے ۔ ہاں ، اچھا ۔۔ لڑکا ، لڑکا بھی کیا چیز ہے ۔۔ کیا لفظ ہے ۔'' شوکت آپ ہی آپ سے کہے جا رہا تھا ۔ جیدی ابھی تک سٹیرنگ پہ سر رکھے بیٹھا تھا ۔

'' میں کہتا ہوں ، لعنت بھیجو اب اس پر ۔'' شوکت نے اسے پھر جھنجھوڑا اور دل میں کوسنے لگا ۔ '' پتا نہیں ، آج کس عذاب میں پھنس گیا ہوں میں ۔'' اس نے اپنا پسینہ پونچھا ۔

'' میں عبدل کو قتل کرا دوں گا ۔'' یکبارگی جیدی اُچھل پڑا اس نے زور سے ماتھے کو پیٹا اور پھر ہاتھ پر ماتھا ٹیک کر بیٹھ گیا ۔

'' قتل ـ قاتل تو تم ہو ہی ـ ظالم ـ دل کرتا ہے تمہیں چوم لوں ـ'' شوکت اسے دیکھتے سوچ رہا تھا ـ شوکت کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا ـ

'' شوکی ، میں کسی دن اپنا چہرہ مسخ کر لوں گا ـ''

'' پاگل ہو تم بھی ـ'' اس نے جواب دیا ـ '' پاگل ـ پاگل ـ ہاں ، ہاں ـ پاگل ـ'' اس نے دل میں دہرایا ـ '' اچھا ـ اب چلاؤ گاڑی ـ شاباش ـ'' اس نے جیدی کو تھپتھپایا ـ

'' اسے اپنی پڑی ہے ـ'' شوکی نے ایک ہاتھ سے دوسرے کی انگلیاں کھینچتے ہوئے دانت پیسے ـ

'' شوکت یار ...''

'' چلو یار ـ دیر ہو رہی ہے ـ چلو واپس ـ'' اس نے بڑی سرد مہری سے کام لیا ـ '' شوکت کا بچہ ، گدھا !!'' اس نے جیدی کو دل ہی دل میں گالیاں دیں ـ

'' شوکت ، مجھے کوئی ایسا ساتھی نہیں ملا جس پر میں اعتماد کر سکوں ـ''

'' ساتھی ـ پگلے ـ میں ... کیا میں ـ بھی نہیں تمھارا ساتھی ـ''

'' شوکت ، آپ ، میرا مطلب ہے تم ؟ ہاں ، ہاں ـ یار ، مجھے دھوکا نہ دینا ـ''

'' دھوکا ـ دھوکا ـ'' شوکت بے خیالی میں یہ الفاظ دہرا گیا ـ

'' شوکت ـ دیکھو ، دیکھو ـ دھوکا نہ دینا ـ'' اور جیدی کی آواز حلق میں پھنس گئی ـ

'' ارے تم تو رو رہے ہو ... پگلے ـ'' شوکت نے قریب ہو کر رومال سے اس کے آنسو پونچھے ـ

'' دیکھو ـ میرے پاس دولت ہے ، ذہانت ہے ، لیاقت ہے اور عزت بھی ـ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ـ مگر نہیں ہے تو دوست نہیں ہے ـ پتا نہیں کیوں نہیں ہے ؟''

'' اور میں ـ کیا میں بھی نہیں ؟''

'' تم ـ ہاں ، ہاں ـ تم ہو ـ مجھے لگتا ہے تم ہو ـ'' اور جیدی نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا ـ

'' شوکت ، تمہیں ایک بات بتاؤں ؟''

'' بتاؤ ـ''

'' کوئی کسی کا نہیں ہوتا ـ'' جیدی نے اپنا سر اس کے شانوں

پر رکھ دیا۔

"جیدی، پھر وہی بات، تم باز نہیں آتے، پرے ہٹو۔"

"نہیں، نہیں، خدا کے لیے، میرا یہ مطلب نہیں۔" جیدی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"مطلب ہے یا نہیں ــ مجھے کیا ــ یہ کس دلدل میں لے آئے ہو مجھے؟ کیچڑ میں، مزےدار کیچڑ! وہ تو ہے ــ مگر نہیں، نہیں ــ" شوکت سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنی مٹھی سے گال کو تھپکا۔

"اچھا۔ چلو نہ سہی۔ گاڑی تو چلاؤ ــ دیر ہو رہی ہے۔" اس نے تھوڑی دیر بعد جیدی کو اٹھایا۔

کار چل دی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اسے محسوس ہوئے تو اس نے کھڑکی سے باہر منہ نکال کر دیکھا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا تھا اس نے ایک دم منہ اندر کر لیا۔

"ہوا میں یہ کون اڑ رہا ہے؟ بڑی ان دیکھی شکلیں ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی نے ہوا میں داغ ڈال دیے ہیں۔ نہیں، یہ ٹڈی دل تو نہیں، مگر کیڑے سے ہیں ــ رنگ برنگے۔" اس نے کھڑکی کا شیشہ چڑھاتے ہوئے اپنے سر کو جھٹکا۔

"یہ مجھے آج کیا ہو رہا ہے؟" اس نے ناخن چباتے ہوئے سوچا۔

"جیدی، یہ باہر کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ کھیت ہیں۔"

"ارے ہم اتنی دور نکل آئے!"

"تیز چلو۔"

"یہ تم بہت ہلکے ہلکے چل رہے ہو۔

"ہلکے ہلکے؟" اور پھر جیدی نہیں بولا۔ "ہلکے ہلکے" شوکت نے دل میں دھرایا۔

"یہ دائرے کیسے ہیں آخر؟ کیڑے سے لگتے ہیں مجھے۔ ان کو تو بھون کھانا چاہیے۔ ہاں، چٹپٹے کیڑے ــ آخ تھو۔" وہ پھر اندھیرے کو دیکھ رہا تھا۔

"آج کیسا عجیب سا موسم ہے، جیدی۔" اس نے پھر خاموشی توڑی۔

"ارے تم تو رو رہے ہو، گاڑی چلاتے ہوئے بھی!"

جیدی نے پھر گاڑی روک دی اور اس کے شانے پر سر رکھ کر بیٹھ گیا۔

" میں بہت دکھی ہوں ، شوکت ۔ تمہیں پتہ ہے ، میری ماں سوتیلی ہے ۔ مجھے ہر وقت جھڑکتی رہتی ہے ۔ کہاں پھنس گیا ہوں میں ؟ اللہ میاں کا پتا نہیں مجھ سے کیا بگڑا ہے ! ابا بھی تو پروا نہیں کرتے ۔ شوکت تم میرا گلا گھونٹ دو ، مجھے مار ڈالو ۔ میرا کوئی ساتھی نہیں ۔ میں خود کشی کر لوں گا ۔ میرا کوئی دوست نہیں ۔ مجھے نہیں چاہیے کوئی دوست ۔" شوکت نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کے سر کو اپنی ران پہ رکھ لیا ۔

" فریب بُرا ہوتا ہے ناں ؟ ہاں ، دیکھو ، اگر تم بھی ایسے ہی نکلے تو ؟ میں مر جاؤں گا ۔ میری نیت خراب نہیں ۔ قسم اٹھوا لو مجھ سے ۔ یقین کرالو ، جیسے چاہو ، جیسے چاہو ، ہاں ، کرا لو جس طرح چاہو ۔" جیدی بچوں کی طرح بلک رہا تھا ۔

" اوہ ۔" گویا شوکی چونک گیا ہو ۔

" ہاں ، ارے ارے ، تم یوں ہی گھبراتے ہو ۔ بہت ہیں دوست تمہارے ۔" اس نے جیدی کو سمجھایا اور اس کی ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ " بچے ہو تم بھی ۔" وہ اس کے گالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا ۔ " پیارے بچے !"

" بڑی عجیب سی بو آرہی ہے ۔" اس نے ادھر آدھر سونگھا ۔ " بعض اوقات مجھے پٹرول کی بو اچھی لگتی ہے ۔ دل کرتا ہے نگل جاؤں اسے ۔ بچپن میں مجھے ایک دفعہ کیچڑ اچھا لگا تھا ۔ میں اسے چبا گیا تھا ۔ گندی مٹی ! پر پتا نہیں کیوں مزا آیا تھا ۔" شوکت عجب خیالوں میں گم تھا ۔

اس نے سر اٹھایا اور پھر اپنی ایک انگلی جیدی کے ہونٹوں پر رکھ دی ۔

" ہونٹوں کا لمس ۔ ارے ، ان پر تو دھبے ہیں مگر بڑے خوبصورت ۔ کتنے نرم نرم ہیں ، گرم نرم گوشت کی طرح ، بکری کے بچے کے کچے گوشت کی طرح ۔"

" تم بھی دھوکا دے رہے ہو مجھے ۔ ہاں ، ہاں ، مجھے لگتا ہے ۔ چھوڑ دو مجھے ۔"

" اوں ہوں ۔" شوکت نے گردن نفی میں ہلائی ۔

" بری بات ۔"

" نہیں ، بری نہیں ۔"

" تو پھر کہو ، تم میرے بھائی ہو ۔"

" ہوں ۔"

" یوں نہیں ۔ پورا کہو ، میرے بھائی ہو ۔"

" ہاں ، بلکہ بھائیوں سے بھی قریب " شوکت نے اس کے گال کو تھپتھپایا ۔ اس نے اردگرد دیکھا ۔ سڑک ویران تھی ۔

ہوا میں تاریکیاں سمٹ رہی تھیں ۔ دائرے بن رہے تھے ۔ ایسی تاریکی میں اسے یہ دائرے بڑے عجیب سے لگے ۔

" دھبے ۔ اوہو ، مجھے پھر دھبوں کا خیال آگیا ۔ نہیں کوئی دھبہ نہیں ۔ مگر وہ تو ہیں ۔ آؤ ، دھبو ! چاروں طرف سے بڑھتے آؤ ! تم میں مزہ ہے ۔ بڑے مزیدار ہو ۔ دھب ... یے میرے ہیں مگر میرے ہاتھ میں یہ کون ہے ؟ میں دھبوں کو گرفتار کر لوں گا ۔ ہاں ، اس کی مدد سے ۔ اسے ضرورت ہے ان کی ۔ کتنے اچھے ہو تم ، بھوکے ۔ لاجواب ۔" وہ سوچ رہا تھا ۔

اس نے جیدی کو پچکارا : " تم رو رہے ہو ، جیدی ۔ نہ رو ، پگلے ، غم غلط کرو ۔"

جیدی نے اسے دیکھا ۔ اس کی آنکھیں بند تھیں ۔

" یہ چاروں طرف تارے کیسے ہیں ؟ مگر یہ تو چاند بن گیا سب کا ۔" شوکت گویا محو خواب تھا ۔

" چھوڑ دو مجھے ، غلیظ ، گندے ! " جیدی نے اس کا چہرہ دیکھا تو تلملا اٹھا ۔

" ہوں ۔"

" میں کہتا ہوں چھوڑ دو مجھے ! غلیظ ! " جیدی نے شوکت کو تھپڑ مار دیا ۔

" ارے ۔" شوکت نے جیدی کو پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھا ۔ جیدی اپنے کھلے منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا ۔

شوکت نے گال سہلایا اور جیدی کو ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھ کر خفیف سی مسکراہٹ دی ۔

" معاف کر دو ، معاف کر دو مجھے ۔ تم بہت اچھے ہو ناں ؟ میرے بھائی ، میں اپ سٹ ہو گیا ہوں ۔ پاگل ہوں ۔ ہاں ، ہوگیا ہوں ۔ مار ڈالو مجھے ۔" فوراً ہی جیدی نے اس کا گریبان پکڑ کر سسکیاں بھرنا شروع کر دیں ۔

" بتاؤ ، تم نے مجھے معاف کر دیا ؟ بتاؤ نا ! " جیدی کہے

جا رہا تھا ۔

'' یہ چاند کس طرف چلا گیا ؟ غروب ہو گیا ؟ نہیں ۔ وہ رہا ، ہاں ، ہاں ۔ وہ ۔ میں پگھل رہا ہوں ، پھسل رہا ہوں ۔ اب مجھے اتر جانا ہے ۔ بہہ جانا ہے ۔ چاند میں ، نیچے ہوا میں ، فضا میں ، خلاء میں ۔ دھبہ ۔ دھبہ ۔ چاند ۔ نقطہ ۔ دائرہ ۔ ہاں ، ہاں، ہاں '' اور اس کا سر آہستہ سے ہلا ۔

ادھر جیدی اسی طرح کہے جا رہا تھا '' بتاؤ نا ، تم نے مجھے معاف کر دیا ؟ بتاؤ نا ! دیکھو ، میں نہیں بولتا ۔ بتاؤ ۔'' مگر وہ خاموش تھا ۔

'' ہاں ، شاباش ۔'' وہ بولا ۔

'' میرے پاس آ جاؤ ۔ اچھے بنو ، بہت ! ہاں ، تم — آؤ مل کر چاند میں ، دھبوں بھرے چاند میں ، اس دھبے میں اتر جائیں ۔ یہ کہیں کھینچ رہا ہے ۔ ہاں ، کھنچ جانے دو مجھے ، پکڑ لینے دو مجھے ۔'' وہ پھر سوچنے لگا اور جیدی ابھی تک سسکیاں بھر رہا تھا ۔

'' نہیں ، نہیں ۔ کوئی بات نہیں ۔'' اس نے جیدی سے کہا اور جھک کر اسے چومنے لگا ۔

'' ہم میں کوئی فرق نہیں ناں ؟''

'' نہیں ۔''

'' یوں نہیں ، پورا کہو ہم میں کوئی فرق نہیں ۔''

'' ہاں —''

'' تم بہت اچھے ہو ناں ؟ ''

اور تھوڑی دیر بعد شوکت سوچ رہا تھا ۔ '' دھبے دور چلے گئے ۔ چاند چھپ گیا ۔ یہ پھر تارے بن رہے ہیں ۔ بننے دو ۔ مجھے کیا ! '' تھوڑی دیر بعد جب وہ شہر پہنچے تو جیدی نے شوکت کو اس کے گھر اتار دیا ۔

'' کل ملیں گے ۔''

'' ملیں گے ناں ضرور ۔'' جیدی نے دوبارہ کہا ۔

'' ضرور '' شوکت بولا — اور جیدی گاڑی کو تیزی سے لے گیا ۔ شوکی اسے دور جاتے دیکھ رہا تھا ۔ دور جاتی کار اسے ایک دھبہ نظر آ رہی تھی ۔

* * *

ظہیر کاشمیری

ہمراہ زلف ، چشم گریزاں بھی آئے گی
وہ آئیں گے تو گردش دوراں بھی آئے گی

نکلے گی بوئے زلف ، ہماری تلاش میں
صحرا میں اب ، ہوائے گلستاں بھی آئے گی

وہ جن کو اپنے ترک تعلق پہ ناز تھا
آج ان کو ، یاد صحبت یاراں بھی آئے گی

ہم خود ہی ، بے لباس رہے ، اس خیال سے
وحشت بڑھی تو سوئے گریباں بھی آئے گی

طے ہو چکا ہے سود و زیاں کا معاملہ
زخم آئیں گے ، تو لذت پیکاں بھی آئے گی

اے رہ نورد عشق سنبھل کر قدم بڑھا
اس راستے میں ظلمت ہجراں بھی آئے گی

وہ برق ، جو حدود نظر سے پرے رہی
وہ برق اب قریب رگ جاں بھی آئے گی

ڈھونڈھے گی سر برہنہ ہمیں دشت ہجر میں
اک دن جنوں میں ، غیرت جاناں بھی آئے گی

مٹ جائے گا یہ کرب شب غم بھی اے ظہیر
صبح نشاط و فصل نگاراں بھی آئے گی

* * *

شہزاد احمد

تلخ ہے نوا میری ، زہر گھل گیا اس میں
تو تو بے خبر ٹھہرا ، تیری کیا خطا اس میں

آنکھ عجیب قریہ ہے ، بے چراغ رہتا ہے
دل عجیب گنبد ہے ، بند ہے صدا اس میں

یہ بجھی بجھی سی شئے ، اس کو پھول کہتے ہو
لے اڑی ہوا خوشبو ، رنگ رہ گیا اس میں

مدتوں سے آنسو بھی آنکھ سے نہیں ٹپکا
ہم نے ایک دریا کو خشک کر دیا اس میں

اے خدا لیا تو نے سخت امتحاں اب کے
مجھ کو زندگی بھر کی مل گئی سزا اس میں

بس گئی ہے کمرے میں کچھ ملی جلی خوشبو
ایک تو میں ہوں موجود اور کون تھا اس میں

یوں چلے تو منزل پر سو برس میں پہنچو گے
یہ سفر ہے دوری کا صبر ناروا اس میں

بولتی کتاب اس کی حرز جاں تو ہے لیکن
کچھ سمجھ نہیں پڑتا اس نے کیا کہا اس میں

رنگ شوخ اتنے ہیں ، بند آنکھ ہوتی ہے
دل کی روشنی لیکن کوئی ڈھونڈتا اس میں

عکس دیکھ کر اپنا آپ ہو گیا پاگل
اس نے یہ کنواں کھودا ، خود ہی گر پڑا اس میں

یہ زمین تو شہزاد تیرگی کا صحرا ہے
کچھ پتہ نہیں چلتا اک چراغ کا اس میں

* * *

شہزاد احمد

دکھائی دیتا نہیں ، روشنی میں ڈرتا ہوں
کہاں گئیں مری آنکھیں تلاش کرتا ہوں

خیال ہوں کوئی احساس کیوں کرے میرا
میں بوئے گل کی طرح بے صدا گزرتا ہوں

نہیں ہوں سنگ کہ دریا ڈبو سکے مجھ کو
ہوا ہوں اور کفِ دریا پہ پاؤں دھرتا ہوں

وہ ابر ہوں کہ جسے آندھیوں نے پالا ہے
ہوا میں خاک کی خوشبو نہ ہو تو مرتا ہوں

میں آرزو ہوں اگر کوئی مجھ کو اپنا لے
میں رنگ ہوں کسی تصویر پر نکھرتا ہوں

شجر نہیں ہوں کہ پتے ہوا اڑا لے جائے
میں نور ہوں کسی آئینے پر بکھرتا ہوں

ابھی تو موج کی مانند بے قرار ہوں میں
خبر نہیں کہاں رکتا ہوں کب ٹھہرتا ہوں

زمین ناؤ مری بادباں مرے افلاک
میں ان کو چھوڑ کے ساحل پہ کب اترتا ہوں

ہوں آدمی مجھے تلقین صبر کیوں شہزاد
یہی بہت ہے کہ میں احتیاط کرتا ہوں

* * *

ظفر اقبال

روکو گے تو ہم کریں گے دنگا
بن جائے گا بات کا بتنگا

خیر ، آپ بھی بد معاش ہوں گے
میں ہوں ذرا مختلف لفنگا

ہاں ، خواجہ سراؤں کی زباں میں
کہتے ہیں وہ شعر مجھ سے چنگا

خصی ہوں خیال و خواب جن کے
دل کیوں نہ ہو اُن کا بے اُمنگا

کپڑے پہناؤں کیا سخن کو
سر پر مرے آسماں ہے ننگا

بھگتو اب قارئین کو بھی
کیوں مفت میں لے لیا تھا پنگا

باہر کہیں جا کے خاک اُڑاؤں
گھر میں تو بہہ رہی ہے گنگا

اپنی زد میں نہیں ابھی میں
اُس کا ہی ابھی کیا ہے کنگھا

ہوتا بھی ، ظفر ، نباہ کیونکر
چھوٹا تھا پتنگ سے پتنگا

* * *

ظفر اقبال

ہتھ لگن دے نال ای ساہ لیندی ایہہ آہبے ، نی
کیہہ ہٹواسیں چھیاں ، کیہہ چھکواسیں ہبے ، نی

کیہی بروٹی پھلی آ ، ہری ہنیری جھلی آ
لنگ نظر نوں چبھے ، نی ۔ رنگ تلی وچہ کھبے ، نی

کنجی دے وچہ بھنیسے رہھڑ والے گڑ نوں
رولا پیا تے پہنچیاں خبراں اتے آہبے ، نی

پھلے اندر چور ہٹے ، لے گئے ہونجا پھیر کے
اپنا کھرا ای نپئے جے کجھ لبھے لبھے ، نی

اندروں باہروں کسے نوں ملی نہ ہاتھ ہوا دی
کھوہ ساہواں دے ٹبے ، نی ۔ کھاڈے دیوچہ ڈبے ، نی

کدی جے ہن دیاں چھٹیاں ظفرے کول گزار لئیں
سون بہن دا طمع نہیں ، نال رہن دی حُب اے ، نی

* * *
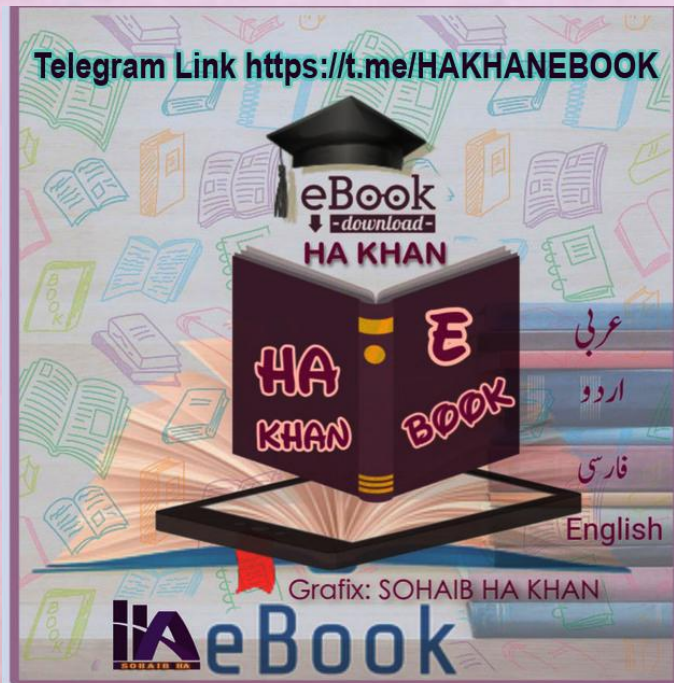
ظفر اقبال

ساہویں متھے وچہ پئی بھیر ہوا دی ُہجھ ، نی
پھیر اکھاں دے عکس وچہ بلدی بلدی َبجھ ، نی

دھوڑاں دھپاں جال کے ، ہڑہ ہنیر ہنگال کے
امباں دی خشبوئی تے کون آیا ای ، َبجھ ، نی

لاہیے سخر دوپہر ، نی ، گتلی تتسے تاء تے
بھری پرانے گجھ ، نی ۔ ہوئے نبیڑا کجھ ، نی

کدھرے بھال سمہال ، نی ، لہو وچہ مچھی موت دی
گنڈھ پرانے جال نوں ، نویں رجھیویں رجھ ، نی

لکھیے دونویں رل کے وین کسے انہوئی دے
جبھی اندر جاگ ، نی ۔ ساہواں اندر سجھ ، نی

پئی بھسوڑی اینکی کوئی اولی ظفر نوں
اہڑ کسے وسیلڑے ، کسے بہانے بج ، نی

* * *
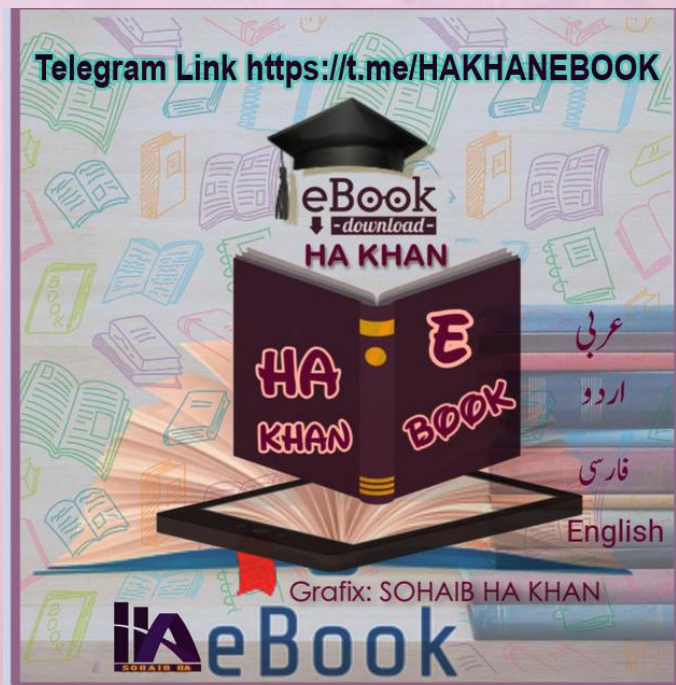
جاوید شاہین

دن رات مکدر سی فضا ساتھ ہے میرے
ٹھہرے ہوئے موسم کی بلا ساتھ ہے میرے

اٹھتے ہیں رگ و پے میں ہوس رنگ بگولے
خواہش کی بہت گرم ہوا ساتھ ہے میرے

ٹھہروں تو ڈراتا ہے کڑی دھوپ کا منظر
چلتا ہوں تو اک پیڑ گھنا ساتھ ہے میرے

جی میں ہے کہ بوسیدہ بدن دیکھوں بدل کر
صدیوں سے یہ بے رنگ قبا ساتھ ہے میرے

بیدار ہے یوں دشت تمنا میں چھٹی حس
جیسے کوئی دشمن بھی مرا ساتھ ہے میرے

بوجھل ہے بہت زخم مسلسل کی ہری شاخ
جس رت میں بھی جو پھول کھلا ساتھ ہے میرے

کچھ بے سرو سامانیاں ہیں تنگ اقامت
کچھ نقل مکانی کا مزا ساتھ ہے میرے

وہ بات اسے کہہ دوں یہی وقت ہے شاہین
جس بات پہ سب خلق خدا ساتھ ہے میرے

* * *

انور شعور

بشارت ہو کہ اب مجھ سا کوئی پاگل نہ آئے گا
یہ دور آخر دیوانگی ہے ، بیت جائے گا

کسی کی زندگی ضائع نہ ہو گی اب محبت میں
کوئی دھوکا نہ دے گا اب کوئی دھوکا نہ کھائے گا

پرخچے اڑ گئے ہیں ان سروں کے جن میں سودا تھا
قیامت تک کسی سر میں نہ اب سودا سمائے گا

نہ اب اترے گا قدسی کوئی انسانوں کی بستی پر
نہ اب جنگل میں چرواہا کوئی بھیڑیں چرائے گا

گروہ ابن آدم لاکھ بھٹکے لاکھ سر پٹکے
اب اس اندر سے کوئی راستہ باہر نہ جائے گا

رکھ اطمینان اے دنیا کہ دور آسماں ، تیرے
جو قرضے ہیں اتارے گا جو احساں ہے چکائے گا

کسی دن کوئی قاہر دفعتاً آئے گا اور آ کر
انھی منحوس نسلوں سے مبارک باد پائے گا

سلگتے راکھ ہوتے شہر واویلا مچائیں گے
جہنم جھوم کر دھیمے سروں میں گنگنائے گا

بشر کو دیکھ کر بے انتہا افسوس ہوتا ہے
نہ معلوم اس خراباتی کو کس دن ہوش آئے گا

کلیجے سے لگا لے اے زمیں تو ہی اب انساں کو
فلک کے سامنے بدبخت کب تک گڑگڑائے گا

مٹا بھی دے مجھے اب اے مصور تابہ کے آخر
بنانے گا بگاڑے گا بگاڑے گا بنانے گا

اسے اک پل بھی دیکھو تو سنبھل کر دیکھنا ورنہ
وہ اک پل میں سمٹ کر اک صدی میں پھیل جائے گا

محبت بھی کہیں اے دوست تردیدوں سے چھپتی ہے؟
کسے قائل کرے گا تو کسے باور کرائے گا

بکھر جائے گا خود کو ڈھونڈنے کوئی دو عالم میں
محقق مدرسے میں بیٹھ کر کڑیاں ملائے گا

نہیں مجھ پر کوئی درباز روشن شاہراہوں کا
اندھیرا ہے ، اندھیرا ہی کوئی رستہ سجھائے گا

غنیمت جان اگر دو بول بھی کانوں میں پڑ جائیں
کہ پھر یہ بولنے والا نہ روئے گا نہ گائے گا

ابھی وارستگی و بستگی میں فرق کیا معنی
ابھی تو یہ کرہ لاکھوں در و دیوار اٹھائے گا

کوائف لکھنے والا بے تصرف رہ نہیں سکتا
بڑھانے کا اگر موقع نہ ہو گا تو گھٹائے گا

کرے گی عاشقی لمحات کو برباد لیکن عشق
انھی بیکار پیمانوں کو کارآمد بنائے گا

مکمل روپ کیا دھاریں گے تیرے خوشہ چیں تیرا
کوئی رنگت اڑائے گا کوئی خوشبو چرائے گا

چمک تو پھر چمک ہے ، آپ کی آنکھوں کا آنسو بھی
زمیں میں جذب ہو کر آسماں میں جگمگائے گا

لکیریں اور کچھ کہتی ہیں لیکن دل یہ کہتا ہے
بہت آلام جھیلے گا بہت صدمے اٹھائے گا

شعور اس کو بھلا ہم سے زیادہ جانتے ہو تم ؟
بہت سیدھا سہی لیکن تمھیں تو بیچ کھائے گا

* * *

ذوالفقار احمد تابش

ایک اندیشہ ہے دل میں کہ نکلتا ہی نہیں
ایک سودا ہے مرے سر میں کہ جاتا ہی نہیں

ہے مرے گرد سراسیمہ ہیولوں کا ہجوم
ایک خاموش خلا ہے کہ بکھرتا ہی نہیں

روح بے چین ازل سے ہے رہا ہونے کو
جسم کا خول ہے ایسا کہ پگھلتا ہی نہیں

یہ اندھیرا ، یہ ازل کا مرا خاموش رفیق
دور رہتا ہے ، مرے دل میں اترتا ہی نہیں

پاس آتا نہیں ، چپ چاپ کھڑا رہتا ہے
دیکھ لیتا ہے ، مگر بات وہ کرتا ہی نہیں

منتظر دیر سے ہیں ذہن کے خاموش افق
اس اندھیرے میں کوئی چاند ابھرتا ہی نہیں
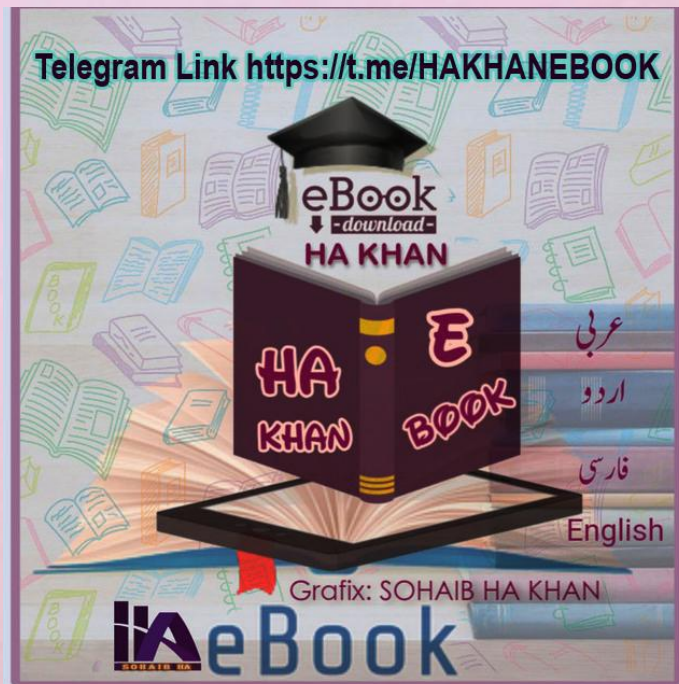
ایک نظم

زاہد ڈار

کوئی بھگوان کی آواز نہیں سن سکتا
کوئی اس دنیا میں آزاد نہیں رہ سکتا
کوئی انصاف نہیں کر سکتا
امن سے کوئی نہیں جی سکتا
جنگ میں کوئی نہیں مر سکتا
روشنی اور اندھیرے میں کوئی فرق نہیں
گرم اور سرد میں کچھ فرق نہیں
دھوپ اور چھاؤں میں کچھ فرق نہیں
جسم اور روح میں کچھ فرق نہیں
جسم پرواز نہیں کر سکتا
روح بیمار نہیں پڑ سکتی
ہاتھ زنجیر نہیں بن سکتا
آنکھ دیوار نہیں بن سکتی
لفظ پتھر بھی ہے ، پانی بھی ہے اور آگ بھی ہے
وقت دریا بھی ہے ، صحرا بھی ہے ، آکاش بھی ہے
زندگی موت سے پہلے بھی ہے اور بعد بھی ہے
جس نے دیکھی ہے تصوف کی کتاب
اس کو معلوم ہے کیا ہوتا ہے
شانت ساگر کی طرح ساکن ہے
تیرگی اس کو ڈراتی ہے نہ تنہائی جلاتی ہے اسے
موت آتی ہے اسے اور نہ وہ زندہ ہے
وہ نہ بوجھل ہے ، نہ ہلکا ہے ، نہ چھوٹا ، نہ بڑا
وہ نہ خاموش ہے نہ بولتا ہے
اس کو معلوم ہے وہ خالی ہے
جس نے دیکھی ہے تصوف کی کتاب

وہ ایک لمحہ

عادل منصوری

وہ ایک لمحہ
جو سر پٹکتا ہے پتھروں پر
پڑا ہوا ہے جو شام کے پھیلتے دھوئیں میں
لہو میں لت پت
وہ ایک لمحہ
کہ جس کی خاطر
ہزاروں صدیاں کروڑوں سالوں سے
آبلہ پا
مگر وہ لمحہ
سفر کی پہلی اداسیوں کے
کبوتروں کے پروں سے الجھا
سواد منزل کی مشعلوں میں
پگھل پگھل کر عیاں ہوا ہے
وہ ایک لمحہ -- سلگتے شبدوں کی انگلیوں سے گرا جو نیچے
تو دھنس گیا پھر اٹل معانی کی دلدلوں میں
مگر یہ اچھا ہوا کہ اس دم
کھجور بھر کر جہاز آئے
تمام نظریں کھجور کی گٹھلیوں میں انزال ڈھونڈتی تھیں
وہ چھ مہینے حمل اٹھائے
ہمارے گھر کی قدیم زینت
نہ سیڑھیوں پر نہ کھڑکیوں میں
نہ چائے کی پیالیوں سے اٹھتے دھوئیں کے پیچھے
تمنا کاغذ پہ پھیل جائے تو
اس کی شدت کا نام ٹوٹے
نئی سڑک پر
پرانی اینٹوں کے درمیاں وہ
بس آہٹوں میں الجھ گئی ہے
سفید بکری کی آنکھ سے
کون جھانکتا ہے تمہیں خبر ہے ؟
تمہیں خبر ہو تو مجھ سے کہہ دو

میں اپنے والد کی قبر کا راستہ تلاشوں
ادھر بھی سورج میں سارا منظر
لہو لہو ہے
ادھر بھی سایوں میں ساری آنکھیں
دھواں دھواں ہیں
یہ بند آنکھوں میں
کون چھپ کر
بدن کے اندر میں
جھانکتا ہے ؟
خوشیوں کے کھنڈر میں گونجی اذان فجر کی
وضو کے پانی کے ساتھ سارے گناہ ٹپکے
دعا میں اس نے شراب مانگی تو
تشنگی کے سراب چھلکے
ستارے نیچے اتر کے آئے ۔
وہ ایک لمحہ
شکستگی کے بدن کے اندر
وہ ایک لمحہ
شگستگی کے بدن کے باہر
وہ ایک لمحہ
ہزار صدیوں کے بندھنوں سے
نکل کر آیا ۔
وہ ایک لمحہ
جو دسترس کے وسیع حلقوں سے دور رہ کر
رطوبتوں میں بڑی تمازت سے تیرتا ہے ۔
مقدروں میں
ہزار لمحوں کے درمیاں اس کا تخت خالی
وہ ایک لمحہ
جو سر پٹکتا ہے پتھروں پر
پڑا ہوا ہے جو شام کے پھیلتے دھوئیں میں
لہو میں لت پت
وہ ایک لمحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد ۔ ۵

صلاح الدین محمود

شجر کے سائے میں گنبدِ مبہم کے آسمان
صدا کے بازو میں وسعتِ ساحل کے پاسبان
نور کا رخ چھوئی آواز میں گم نام
عالمِ امکاں میں پنہاں اونچے گہرے بادبان
یہ خدا جو میرا خدا ہے
قدم پرے سے اک نگہ کا گماں
کل کے لمحے میں آج جیسا ساں
گنبدِ مبہم میں ایک جان
خدا جو میرا خدا ہے
سکوت کے پہلو میں آسماں کا نشان
یہ خدا جو میرا خدا ہے

حمد ٦
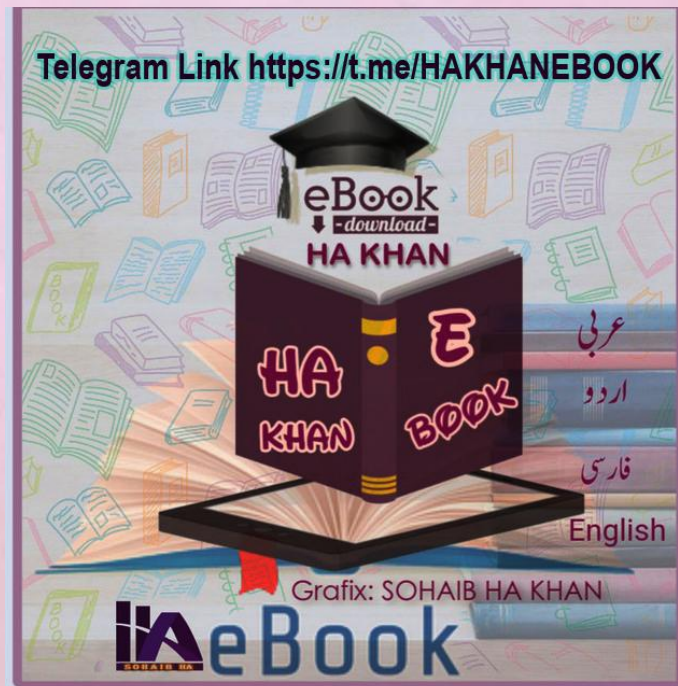
صلاح الدین محمود

پُتلی پُتلی جزا کی آنکھو
گوشِ ہوا کی پگھلتی ندی
جڑوں کے بن میں ندا کے کانو
نورِ نوا کی پگھلتی ندی

رقصِ صبا رخِ وحدت یک دم
نورِ نوا کی حرکت مدھم
ورقِ ہوا ہر دھار میں پیہم
گوشِ زباں میں دیدۂ یک سم

پُتلی پتّلی سمٹتی آنکھو
ہوا کے کانوں پگھلتی ندی
چشمِ پنہ کیوں مجھ میں سمائی
نورِ نگہ کی پگھلتی ندی
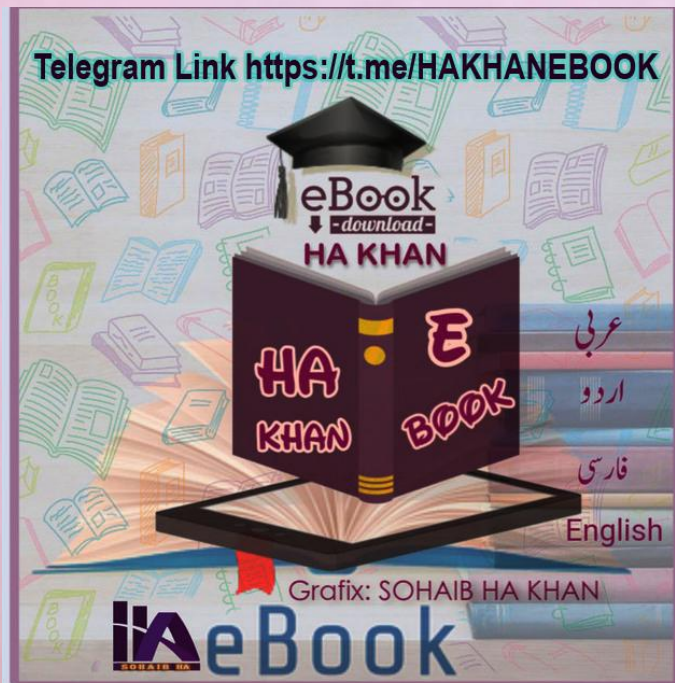
اے بُرے شہر

فاروق حسن

عشق کا نام نہیں شہر میں چاروں جانب

رحم ، ہمدردی کی رسوائی کے ہنگام میں ہیں
شہر والے کسی تکلیف کے ایام میں ہیں
خوب آرام میں ہیں

شہر سب نیند میں ہے
اور چڑیوں کو چہکنے نہیں دیتے کہ کہیں
رات آرام کی آس کو نہ ملے
جو بہت جاگ چکا ہو دن میں

شہر والوں کی بھلائی کا بہت چرچا ہے
اور تحقیر کی خوراک پہ پلتے ہوئے لوگ
تندرست اور توانا ہیں بہت
ہوشمندوں میں ہیں دانا ہیں بہت
اس برے شہر کے آلام میں ہیں
اور تسکین میں ، آرام میں ہیں

عشق کا کام ہے کیا شہر میں چاروں جانب
جو ذرا ایک گھڑی جسم سے اوپر اٹھا
وہ سلاخوں کے ، فصیلوں کے مقابل آٹھا
رات کے ایک پہر
سیٹیاں بجتی ہیں
پھر بھاگتے قدموں کی صدا آتی ہے
اور سوتے ہوئے سب لوگ گھروں کمروں سے
کھڑکیوں صحنوں سے گھبرائے ہوئے اٹھتے ہیں
دوڑ باہر کی طرف جھانکتے ہیں

کون تھا جس نے ابھی
دشمنی اور کدورت کی ستائش کے زمانے میں یہاں

عشق کا نام لیا
شہر میں شور کیا
شہر کو بدنام کیا

دوسری آواز

اے برے شہر تیری اینٹوں پر
اب کوئی شخص کوئی نام نہیں لکھے گا
اے برے شہر تیری گلیوں میں
داستانیں تری سو جائیں گی
موت کی نیند میں کھو جائیں گی

اے برے شہر برا ہو تیرا
جیتے جی تو نے ہمیں مار دیا
جاگتے جیتے ہوئے لوگ سبھی سوچتے ہیں
جاگنے جینے سے کیا حاصل ہے

اس برے شہر سے مُردوں کا بیاباں اچھا
رحم کی آن سے توقع تو نہیں
شہر کو چھوڑ کے قبروں کو چلیں
زیست کا کام نہیں شہر میں چاروں جانب

عشق کا نام نہیں شہر میں چاروں جانب
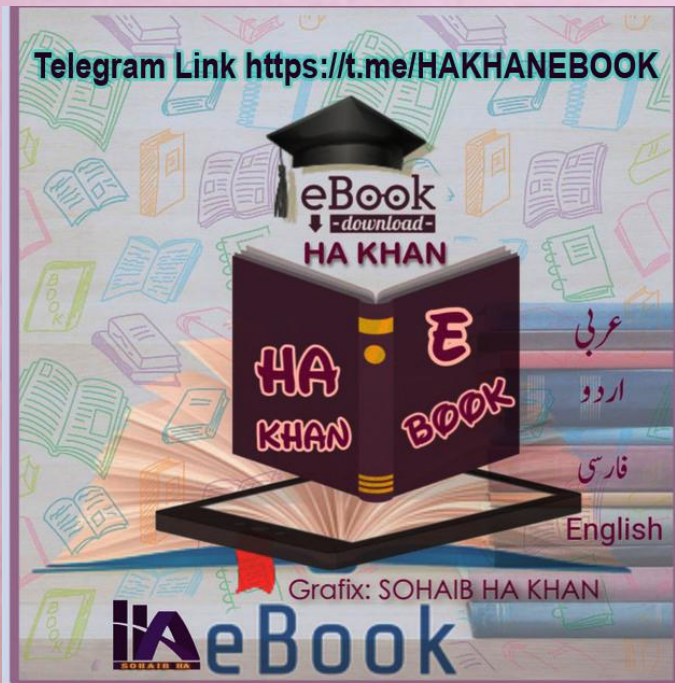
لوٹنے والے ، رکنے والے

نسیم بخاری

ایسے سنہرے پانیوں والے شہروں میں تم
گرد میں رہتے ، گرد ہوئے ہو
جسموں کی رنگین دھوپ سے دفتر کی دہلیز تلک
رستے میں کیسے اُفق ہیں
سورج اور پتنگوں والے آئینے ہیں
پل میں ہر آگے آنے والی بلڈنگ کے
وحشت ناک کنارے بڑھ کر
ایک اک آئینے کو تیز ، نکیلی ، جھلمل کرتی ، کرچیں بنا کے رکھ دیتے ہیں
گھنی دھند میں گم منزل کا مر مر چاٹتی
زرد لعاب میں لتھڑی
صدیوں لمبی زبانیں
اک لرزاں خاموش بلاوا
سنتے ہو تو اک سناٹا
دیکھتے ہو تو منظر ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتا ہے

پیچھے دیکھو ! شام ، پہاڑ پہ بھاری چپ کی اوس برستی
لرزاں ڈھلوانیں
کالے ، بنجر طوفان رکے تھے
رک کر آگے چلنے کی کچھ سوچ رہے تھے
سرد ، پرانی ، زرد عبادت گاہیں ، کتنی
آہن کی دیواروں والی ، بارش کی بوچھاڑ میں بجتی
فیکٹریاں
سنگین سیاہی اور سنسان سروں سے ہلتے سر نیہوڑانے
چنے ہوئے انسان
یہاں سب ڈھیر ہوئے ، سب کھیت رہے

رک کر دیکھو ! آسمان سے گرتی گرد کی موٹی چادر
پل پل میل سڑک کے موڑوں میں گم ہوتے
پل پل ہری کی آنکھیں سگرٹ کے ہر کش سے روشن ہوتیں
کہو ! ستارہ
جس کو تمہارے اہل زماں
اپنے دکھتے کولھوں پر ، سالوں
ہاتھ ٹکائے تکتے رہے تھے
کہاں چھپا ہے ، کہاں چھپا ہے

لاهور میں

مراتب اختر

طویل رستوں کو دائرے کاٹتے چلے جا رہے ہیں ۔
دنیا دنوں سے نکلی ہے ،
اور راتوں کے در کھلے ہیں ۔
سیاہیوں میں کہیں کہیں سرخ ، سبز ، پیلے ، سفید جگنو دمک رہے ہیں
ادھر آدھر بوتلیں گلاسوں کو بھر رہی ہیں
تمام چہرے ، وہ جسم ، وہ سر سے پاؤں تک ناتمام چہرے ...
آمڈ رہے ہیں

ادھر آدھر اپنی رات گذری ہوئی ،
برہنہ کہانیاں پھینکتے چلے جا رہے ہیں
فٹ پاتھ پر (جہاں میں کھڑا ہؤا ہوں)
گذر رہے ہیں بڑی روانی سے اور تیزی سے
آہنی شور اور پہیوں میں گھومتے دن ، مجھے ملے تھے
دنوں سے راتیں جدا نہیں ہیں
مرے اندھیرے جہاں کہیں جاؤں میری آنکھوں پہ چھائے ہوتے ہیں
کون جانے !
میری ہزاروں کہانیوں کی کتاب تبویب ہو رہی ہے
مجھے قدم ، دائرے ، کُرے کاٹتے چلے جا رہے ہیں
ترتیب ہو رہی ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم
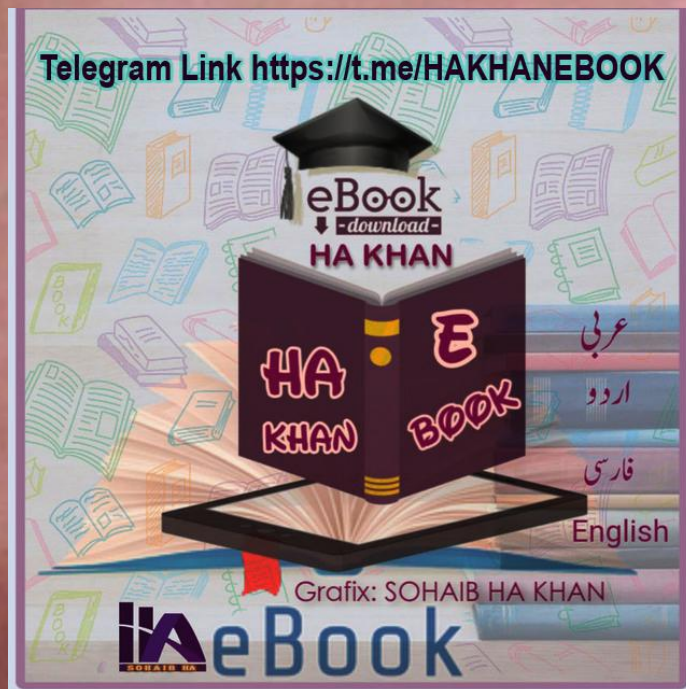
فہرست مطبوعاتِ نیا ادارہ

۱۵ - سرکلر روڈ ، لاہور

ہماری انعام یافتہ کتابیں*

آب رواں سرورق اور زیبائش : حنیف رامے ظفر اقبال

تغزل کی نئی سرحدوں پر فکر کے طوفانی مناظر میں بہتا ہؤا چراغ

(۱۹۶۲ء کی خوبصورت ترین کتاب ، نیشنل بک سنٹر آف پاکستان)

اداس نسلیں سرورق عبد الرحمان چغتائی عبداللہ حسین

برِ عظیم ھند و پاک کی پینتیس سالہ سیاسی و علاقائی تاریخ

(۱۹۶۳ء کی بہترین کتاب ، آدم جی انعام یافتہ)

معیار سرورق ریاض احمد چودھری ممتاز شیریں

ممتاز اور شیریں تنقیدی مضامین کا معیاری مجموعہ

(۱۹۶۳ء کی خوبصورت ترین کتاب ، نیشنل بک سنٹر آف پاکستان)

سرراہے سرورق اور زیبائش حنیف رامے مسعود مفتی

ھنستے مسکراتے مضامین ، زندگی کے مضحک پہلوؤں کی تصویریں

(۱۹۶۴ء کی خوبصورت ترین کتاب ، نیشنل بک سنٹر آف پاکستان)

ایک چادر میلی سی راجندر سنگھ بیدی

پنجاب کے ایک سکھ گھرانے کے افراد کی زندگی کا زندہ و جاندار نقشہ

(ساھتیہ اکاڈمی نے ۱۹۶۵ء کی بہترین تصنیف کا اعزاز دیا)

دیوانِ غالب سرورق اور اکیس رنگ دار تصویریں حنیف رامے

تخیل کی ندرت ، الفاظ و آھنگ کا شکوہ ، فکر کی گہرائی

(۱۹۶۵ء کی خوبصورت ترین کتاب ، نیشنل بک سنٹر آف پاکستان)

---

* اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پاکستان میں یہ فخر صرف **نیا ادارہ** کو حاصل ھے کہ اس کی مطبوعات اتنے انعامات حاصل کر چکی ھیں -

نیا ادارہ

کے عہد آفرین مجموعے

— ۱ —

اردو کی نامور اور منفرد ناول نگار

قرۃ العین حیدر

کا نیا ناول

آخرِ شب کے ہم سفر

— ۲ —

فراق گورکھپوری

کی غزلوں کا انتخاب

غزل

اردو غزل کی تاریخ میں **فراق** ایک مجتہد کی حیثیت رکھتا ہے۔ **میر**، **غالب** اور **اقبال** کے بعد اس نے جس مجاہدانہ دیدہ وری اور جس وقار کے ساتھ غزل کو نئے سرے سے ابھارا ہے اور عہدِ نو میں اسے جو منصب عطا کیا ہے اس کا جواب پوری اردو شاعری میں نہیں ملتا۔ **فراق** کی غزلیں فرسودہ اور بے جان روایات کے خلاف انقلابِ عظیم ہیں۔ اس نے اپنی غزلوں میں خالص حسن و عشق کے تصورات میں زندگی کے ٹھوس حقائق اس رمزیت اور اشاریت کے ساتھ سموئے ہیں کہ غزل کی لطافت و نفاست بھی برقرار رہی ہے اور جہانِ غزل نئی وسعتوں سے بھی آشنا ہؤا ہے۔

سرورق اور زیبائش * عبدالرحمان چغتائی

نیا ادارہ

نثری ادب

ناول

آخرِ شب کے ہم سفر	قرۃ العین حیدر	۲۵/-
کالے کوس	بلونت سنگھ	۶/-
ایک چادر میلی سی (انعام یافتہ کتاب)	راجندر سنگھ بیدی	۵/-
اُداس نسلیں (انعام یافتہ کتاب)	عبد اللہ حسین	۱۵/-
اُمراؤ جان ادا	مرزا رسوا (تصویریں: حنیف رامے)	۶/-
باغ و بہار	میر امن (تصویریں: حنیف رامے)	۶/-
معصومہ	عصمت چغتائی	۶/-
سودائی	عصمت چغتائی	۵/-
غدار	کرشن چندر	۳/-
دھوپ اور شگوفے	اے حمید	۵/-
کپتان کا گُڈا	ڈی۔ ایچ۔ لارنس	۳/-
دو ملک ایک کہانی (رپورتاژ)	ابراہیم جلیس	۳/-

طنز و مزاح

سرِ راہے (انعام یافتہ کتاب)	مسعود مفتی	۶/-

ڈرامے

آؤ (مزاحیہ ڈرامے)	سعادت حسن منٹو	۱/۷۵
منٹو کے ڈرامے	سعادت حسن منٹو	۶/-
شیطان (مزاحیہ ڈرامے)	عصمت چغتائی	۳/۵۰
شکنتلا	کالی داس	۲/-
انسان کی زندگی	انڈریف	۳/-

تنقید

معیار (انعام یافتہ کتاب)	ممتاز شیریں	۱۲/-

خطوط

زیرِ لب	صفیہ اختر	۷/۵۰
حرفِ آشنا	صفیہ اختر	۷/۵۰
مکتوباتِ اکبر	اکبر الہ آبادی	۱/۵۰

افسانے

شہرِ ممنوع	واجدہ تبسم	۱۰/-
توبہ توبہ	واجدہ تبسم	۵/-
روشنی کے مینار	جیلانی بانو	۶/-
ایک بات	عصمت چغتائی	۳/-
ہائے اللہ	ہاجرہ مسرور	۳/-
سناٹا	احمد ندیم قاسمی	۶/-
طلوع و غروب	احمد ندیم قاسمی	۳/-
تین غنڈے	کرشن چندر	۳/-
طلسم خیال	کرشن چندر	۳/-
ان داتا	کرشن چندر	۵/-
پانی کا درخت	کرشن چندر	۵/-
زندگی کے موڑ پر	کرشن چندر	۳/-
ٹوٹے ہوئے تارے	کرشن چندر	۳/-
نئے زاویے	مرتب : کرشن چندر	۶/-
سڑک کے کنارے	سعادت حسن منٹو	۵/-
لذتِ سنگ	سعادت حسن منٹو	۳/-
نمرود کی خدائی	سعادت حسن منٹو	۳/-
رفیقِ تنہائی	علی عباس حسینی	۴/-
میلہ گھومنی	علی عباس حسینی	۴/-
باسی پھول	علی عباس حسینی	۵/-
گرہن	راجندر سنگھ بیدی	۵/
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	۴/-
منزل منزل	اے حمید	۵/-
منظر و پس منظر	اختر اورینوی	۴/-
سرکش روحیں	خلیل جبران	۳/-
پتھر کا دل	ترجمہ : سراج الدین نظامی	۴/-
پردۂ سیمیں	ڈاکٹر نصیرالدین احمد	۴/-
درپن	شکیلہ اختر	۳/-
سنہرا دیس	بلونت سنگھ	۵/-
آگ کی آغوش میں	انور	۵/-
بھرے بازار میں	حیات اللہ انصاری	۴/-

تاریخ و سوانح

کارل مارکس	باری	۲/-
مشین اور مزدور	باری	۲/-

سوشلزم	باری	۲/-
قوم اور قومیت	طفیل احمد خان	۲/-
گاندھی ازم ، نیشنلزم ، سوشلزم	ایم - این - رائے	۲/-
اقبال اور اس کا پیغام	خالد و خاور	-/۷۵
عصمت انونو	ثریا اندریمان	-/۷۵
جواہر لال نہرو	گوپال متل	-/۷۵
گاندھی	گوپال متل	-/۷۵
سوویٹ روس کے مزدور	گوپال متل	-/۷۵
اردو ڈراما	عبدالسلام خورشید	۱/-
رائے کے مضامین	ایم - این - رائے	-/۷۵
معیشت زر	ابن الحسن	-/۷۵
تاریخ یونان	جے - بی - بیورہ	-/۷۵
سٹالین	محمد اشرف عطا	-/۷۵
ہمارا لینن	مائل ملیح آبادی	-/۷۵
سائنس اور دنیا	ایچ - جی - ویلز	-/۷۵
سامراج	لینن	-/۷۵
تانیا	پی - لیڈوف	-/۷۵

شعری ادب

نظمیں ۰ غزلیں ۰ گیت

دیوان غالب (انعام یافتہ کتاب)	غالب (تصویریں: حنیف رامے)	۲۰/-
غزل (سرورق اور زیبائش: چغتائی)	فراق گورکھپوری	۲۰/-
آفتاب داغ	داغ دہلوی	۵/-
آہنگ	اسرارالحق مجاز	۶/-
خرابات	عبدالحمید عدم	۶/-
سیف و سبو	جوش ملیح آبادی	۶/-
آیات و نغمات	جوش ملیح آبادی	۶/-
تغزل	ظہیر کاشمیری	۵/-
عظمت آدم	ظہیر کاشمیری	۵/-
۱۹۴۸ء کا شعری ادب	ظہیر کاشمیری	۳/-
جنگل میں دھنک	منیر نیازی	۵/-
صدف	شہزاد احمد	۶/-
آب رواں (انعام یافتہ کتاب)	ظفر اقبال	۵/-
گلافتاب	ظفر اقبال	۶/-

	اپنے دکھ مجھے دے دو	راجندر سنگھ بیدی	۳/-
	رفیقِ تنہائی	علی عباس حسینی	۲/۷۵
	ھائے اللہ	ھاجرہ مسرور	۲/۲۵
	سناٹا	احمد ندیم قاسمی	۳/-
	توبہ توبہ	واجدہ تبسم	۳/-
	جدید ھندی افسانے (ترجمہ و انتخاب)	اشفاق انور	۳/-
	ایک بات	عصمت چغتائی	۲/۵۰
	دوزخ	عصمت چغتائی	۳/-
	سرکش روحیں	خلیل جبران	۱/۷۵
	چار عشق	منظور احمر	۲/-
	منزل منزل	اے حمید	۳/-
	خلا نوردوں کے افسانے	محمد سلیم الرحمٰن	۲/۵۰
	چٹان	اوپندر ناتھ اشک	۳/-
ناول	اداس نسلیں	عبداللہ حسین	۱۲/-
	سودائی	عصمت چغتائی	۲/۲۵
	ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	۶/-
	ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	۲/۵۰
	کالے کوس	بلونت سنگھ	۴/-
	لندن کی ایک رات	سجاد ظہیر	۱/۵۰
	دھوپ اور شگوفے	اے حمید	۳/-
	غدار	کرشن چندر	۱/۵۰
	کپتان کا گڈا	ڈی - ایچ - لارنس	۱/۷۵
تنقید	معیار	ممتاز شیریں	۳/۵۰
ڈرامے	آؤ	سعادت حسن منٹو	۱/۷۵
	شکنتلا	کالی داس	۲/-
	شیطان	عصمت چغتائی	۲/۵۰
طنز و مزاح	سرِ راہے	مسعود مفتی	۲/۵۰
خطوط	مکتوباتِ اکبر	اکبر الہ آبادی	۱/۵۰
	زیرِ لب	صفیہ اختر	۴/-
	حرفِ آشنا	صفیہ اختر	۴/-
شاعری	گجر	قتیل شفائی	۱/۲۵
	شبستان	شکیل بدایونی	۲/-
	آفتابِ داغ	داغ دھلوی	۳/-
	دن چڑھے دریا چڑھے	عباس اطہر	۱/۲۵
	شعری ادب	ظہیر کاشمیری	۲/-
	گلافتاب	ظفر اقبال	۳/-
	اندھیر نگری	شاد عارف	۳/-

نیا ادارہ
۱۹۶۵ء کی خوبصورت ترین کتاب
نیشنل بک سنٹر آف پاکستان
کی طرف سے انعام یافتہ
رنگا رنگ تصویروں سے آراستہ
دیوانِ غالب